فلسفہ کیا ہے؟

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا
صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین دہلی

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

طبع دوم

ربیع الاول سنہ ۱۳۸۲ھ   اگست سنہ ۱۹۶۲ء

مطبوعہ

الجمعیت پریس دہلی

قیمت عمدہ مجلد پارچہ

5/-

فہرستِ مضامین

قرآن اور فلسفہ[1]

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود!
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں! (غالبؔ)

سقراط نے جب فلسفی کو "مشاہدۂ حق کا شیدائی" قرار دیا تھا تو در اصل اس کے ذہن میں "عالم ما بعد الطبیعات" کا تصور نہ تھا، بلکہ ان الفاظ سے اس کا مقصود "نبی" کا وصف بیان کرنا تھا! کیونکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ کو اپنے اصطلاحی معنی کے لحاظ سے محض "حکمت کی محبت" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصطلاحی معنی کی رو سے فلسفہ "مدلل علم" ہے نہ کہ "خالص بصیرت" اور مدلل علم ہی کے معنی میں افلاطون اور ارسطو نے فلسفہ کو استعمال کیا ہے اور یہی مفہوم عام طور پر فلسفہ کا لیا بھی جانے لگا ہے۔

لیکن فلسفہ کو "مدلل علم" کہنے سے اس کا سارا مفہوم ادا نہیں ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وصف کی وجہ سے ہم اس کا امتیاز "عام تجربہ" سے کرنے لگتے ہیں، کیونکہ عام تجربہ کسی شے کو محض رد یا قبول کر لیتا ہے، اس پر غور و فکر نہیں کرتا۔ یہی

---

[1] یہ مقالہ پہلی مرتبہ معارف دسمبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

وصف فلسفہ کو آرٹ یا فن سے بھی ممیز کرتا ہے کیونکہ فن کا کام ایجاد یا تخلیق ہے، غور و فکر نہیں! اسی وصف کی وجہ سے ہم فلسفہ اور 'علم فطرت' میں تشابہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ثانی الذکر کا کام بھی فکر و استدلال ہے، وہ بھی مدلل علم قرار دیا جا سکتا ہے۔ تو پھر فلسفہ کو 'علوم فطریہ' سے کس طرح ممیز کیا جائے؟

فلسفہ اور سائنس (علوم فطریہ) میں فرق و امتیاز کی دو بنیادی وجوہ ہیں:-

(۱) فلسفہ کا موضوع حقیقت کی ناقابلِ تحویل ماہیت ہوتا ہے۔

(۲) فلسفہ کا موضوع صرف ایک واقعہ یا واقعات کے ایک مجموعہ کی انتہائی حقیقت نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ کہ موجود ہے، کل وجود کی انتہائی اور ناقابلِ تحویل ماہیت یا حقیقت کا جاننا فلسفہ کا کام ہے۔ یہ وہ انتہائی حقیقت ہے جس میں پروفیسر ہالڈین کے الفاظ میں "باقی تمام چیزیں تو تحویل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خود اپنے سوا کسی چیز میں تحویل نہیں ہو سکتی، اور اس کے حدود میں باقی تمام چیزیں تو ادا کی جا سکتی ہیں لیکن وہ خود اپنے سوا کسی اور شئے کے حدود میں ادا نہیں ہو سکتی"۔

یہی وہ خصوصیت ممیزہ ہے جو فلسفہ کو سائنس سے جدا کرتی ہے۔ فلسفہ کل حقیقت سے بحث کرتا ہے، اس کے برخلاف سائنس مظاہر کے ایک محدود مجموعہ کا مطالعہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں فلسفہ

حقیقت کی ناقابل تحویل یا انتہائی ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کے برخلاف سائنس یہ سوال ہی نہیں اُٹھاتی کہ ان مظاہر کی تحویل کسی اور قسم کے مظاہر میں ہو سکتی ہے یا نہیں۔

مثالوں سے ہمارے اس اجمالی دعوے کی توضیح ہو سکتی ہے۔ عالم فعلیات زندہ خلیہ کی تحقیق کر رہا ہے۔ اس کا کام یہ دریافت کرنا نہیں کہ آیا اس کی حقیقت مادی ہے یا روحانی، یا بالفاظ دیگر وہ یہ جاننا نہیں چاہتا کہ تخم مایہ کی تحویل مادی توانائی میں ہو سکتی ہے یا شعور میں۔ وہ ان سوالات کو فلسفی کے لیے چھوڑ دیتا ہے کہ ان روحانی اور طبعی اعمال کی حقیقی ماہیت کیا ہے؟ کیا حقیقت کی تقسیم بالآخر روحانی و مادی حقائق میں کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ تقسیم انتہائی اور قطعی ہے؟ یا پھر روحانی حقیقت کی مادی حقیقت میں تحویل کر دی جا سکتی ہے؟ کیا فکر دماغ کی فعلیت کا ایک وظیفہ ہے؟ کیا خود مادی حقیقت کی تحویل روحانی حقیقت میں ہو سکتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر مادہ روح ہی کی ایک تجلی یا ظہور ہے، وہ ان عمیق سوالات کو فلسفی کے لیے چھوڑ کر خود واقعات کی تحلیل کرنے لگتا ہے، ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط کرتا ہے، مثلاً بڑھتی ہوئی تپش کو بڑھتی ہوئی رگڑ سے شرارے کو برقی حلقہ سے۔ اس کے برخلاف فلسفی ہر واقعہ یا واقعات کے ہر مجموعہ (یا حقیقت کے محدود جزء) کو کل حقیقت سے مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے پیشِ نظر محض یہ سوال نہیں ہوتا کہ ایک واقعہ کی توجیہ دوسرے واقعہ سے کیسے ہو سکتی ہے، بلکہ وہ جاننا یہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ کا کلی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اسی سوال کی تحقیق کی کوشش میں بعض دفعہ اس کو حقیقت کی یافت ہو جاتی ہے تو چیخ اُٹھتا ہے:

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود ۔ تاثیر ز آلت از محالات بود
ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست ۔ باقی ہمہ لوہام و خیالات بود (جامی)

بیان بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ فلسفہ کا موضوع بحث انتہائی و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے اور کل حقیقت وجود من حیث کل ہے۔ اس کو ہم انتہائی و "آخر" اس لیے قرار دے رہے ہیں کہ وہ ناقابلِ تحویل ہے یعنی اس کی تحویل کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت میں نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت کا ظہور یا تجلی یا تعین نہیں اور اس لیے بھی کہ اس کے ماوراء کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ وہ ہمہ محیط ہے، کل ہے، جو کچھ بھی موجود ہے اسی میں شامل و داخل ہے،

ع ہرچہ بینی بداں کہ مظہر اوست!

جب فلسفہ کا معروض "کلِ مطلق" قرار پاتا ہے، جو قطعاً آخری و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے، تو فلسفہ تکمیلِ مراد کا نام نہیں ہو سکتا بلکہ تلاش و جستجو، سعی و کوشش، طلب و اجتہاد کا نام ہے! اسی حقیقت کی یافت کے بعد شیخ سینا کی زبان سے نکلا تھا:۔

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت ۔ یک موئے ندانست ولے موئے شگافت

اندر دل من ہزار خورشید بتافت
و آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

جرمنی کے مشہور فلسفی اسٹمپفٹ (Stumpft) نے اسی لیے فلسفہ کو "استفہامی علم" (Question-Seience) قرار دیا ہے، اور ولیم جمیس نے مابعد الطبیعات کی تعریف ہی اس طرح کی ہے کہ وہ سوالات کرنے کی ایک غیر معمولی اور بہیم کوشش کا نام ہے' اور پاولسن کہتا ہے کہ فلسفہ کوئی "سربستہ نظریہ" نہیں بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے!

فلسفہ کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:-

"فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعہ کسی شئے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کا نام ہے" [1]

یہ ہے یورپ کے مایۂ ناز فلسفیوں کی تحقیق جو فلسفہ کی تعریف و ماہیت کے متعلق زمانۂ حال میں کی گئی ہے!

اس تحقیق کی رو سے سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے جس کو قرآن کی زبان میں "عالم شہادت" کہا جا سکتا ہے اور

---

[1] دیکھو M.W. Calkins کی کتاب
Persistent Problems of Philosphy. باب اول صفحہ ۳ تا ۶

فلسفہ عالمِ شہادت کی انتہائی حقیقت یا ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے جو غیب کا دائرہ ہے اور جس کو قرآن کی زبان میں "عالمِ غیب" قرار دیا جا سکتا ہے۔

سائنس کا کام عالمِ شہادت کے واقعات کا بیان کرنا ہے جے آر تھر ٹامسن نے دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ یہ واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"۔ عالم سائنس مظاہرِ عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہے جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط یا عمل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانینِ عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرزِ وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا۔ غرض عالم سائنس کا کام اس عالمِ شہادت سے ہے، اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی

توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے، اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے بیان کرنے میں وہ حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے، کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہے اور "سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے بیان کی عملی تصدیق کرتا ہے۔

عالم سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالم غیب کی تلاش ہوتی ہے، وہ مظاہر کے عالم کے ماوراء پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے، اس حقیقت الحقائق کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی اور آخری حقیقت ہے، جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء میں شدتِ ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے!

اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کیا ہے! اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافت کی تڑپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے اور اپنے

نفس کو مخاطب کر کے کہتا رہا ہے :-

یک دم غمِ جاں بخور غمِ ناں تا کے در پرورشِ ایں تنِ ناداں تا کے
اندر رہِ طبلِ شکم و نائے گلو (رومی) ایں رقصِ زنخ بضربِ دنداں تا کے

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالمِ شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی و اعتباری غیوب کہا جا سکتا ہے!

غالب نے اس حقیقت کو کیا خوب ادا کیا ہے!

ہر غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کبھی بھی نہیں ہو سکتی! "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ" (پ۲۰ ع۱)[1] سے قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے! اور "قُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ"[2] (پ۱۱ ع۱) بہ رز دے کر انسان سے اس کے علم کی قطعی نفی کر رہا ہے!

"تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادّعای نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب کے کلی و یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا ہے ارتیابیت، اور لاادریت

---

[1] کہہ دو (اے محمد) کہ زمین اور آسمان میں سوائے اللہ کے کوئی غیب کو نہیں جانتا۔ [2] غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

نے ان کے ان بلند بانگ دعووں کی شدت سے تردید شروع کردی اور انسانی علم کو عالمِ شہادت ہی تک محدود کردیا۔ ہیوم نے فلسفۂ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ یہ واضح کردیا ہے کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دارومدار "ارتسامات" یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے، لہذا 'محسوس' ہی کو ہم 'موجود' کہہ سکتے ہیں اور 'غائب' کا ہمیں کوئی علم نہیں ہوسکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کانٹ کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول ہے۔ "حقائق اشیاء" کو کانٹ کی اصطلاح میں بواطن دیا (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں ظواہر یا "Phenomena" یا قرآن کی اصطلاح میں "عالمِ شہادت" تک محدود ہے۔

قدیم زمانہ میں اشراقیہ اور جدید زمانہ میں سریہ (Mystics) اور برگسان جیسے فلاسفہ نے غیب کے علم کے لیے حواس و عقل کو تو قطعاً ناقابلِ علم قرار دیا لیکن 'کشف' یا 'وجدان' یا 'سری ذرائع علم' کے نام سے جس علم کے دامن میں پناہ پکڑی وہ محض ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے جو ڈوبنے سے بہرحال نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ لاادریہ اور

ارتیابیہ نے جن دلائل سے انسانی عقل کو حقائق اشیاء یا غیب کے علم کے ناقابل قرار دیا وہی دلائل کشف و وجدان کے خلاف استعمال کیے جا سکتے ہیں اور بتلایا جا سکتا ہے کہ عقل کی طرح کشف و وجدان بھی انسانی علم ہی کی کوئی قوت ہے اور عقل و استدلال کی طرح اضافی اور اعتباری ہے اور اس کو بھی ناقابل خطا اور یقینی اسی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا جس طرح کہ انسانی عقل و استدلال کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دونوں بہرحال انسان کے محدود، ناقص، اضافی و اعتباری ذرائع علم ہیں۔

قرآن نے اس حقیقت کو مختلف طرح سے تعبیر کیا ہے۔ نہایت قطعیت اور وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا گیا ہے کہ غیب کا علم انسان کو بذات خود حاصل نہیں ہو سکتا، صرف حق تعالیٰ ہی کے دینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لو۔

یہ امر کہ علم غیب خاصہ حق تعالیٰ ہے اس کے سوا کسی کو نہیں۔ قرآن مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایجابی طور پر اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] (پ ۱۲ ع ۱۰) اور نفیاً اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ

---

[1] آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے۔

وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ اور غیر اللہ سے علمِ غیب کی مطلق نفی اس طرح کی گئی ہے: وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَآ اِلَّا ھُوَ[1] (پ ۷ ع ۱۳)

تاریخ فلسفہ جدید میں لاادریہ، ایجابیہ، نتائجیہ نے انسانی علم کو مظاہر ہی کی حد تک محدود کر دیا اور مطلق اور غیب کے علم کی اس سے نفی کر دی، اور اس طرح انسان کو غیب کے علم سے ہر طرح محروم کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے غیب کے علم کی طلب و خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس کے قلب میں غیب کے حصول دیافت کی تڑپ پائی جاتی ہے اور اسی تڑپ اور طلب و جستجو نے اس کو حیوانوں سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کی تشفی کا انتظام ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ گو غیب کا علم انسان کو نہیں، اس کے حواس اور عقل اور تمام ذرائع علم اس کے حصول کے براہ راست قابل نہیں لیکن اگر اللہ چاہے تو کسی ذریعہ سے اپنے غیب کا علم انسان کو دے سکتا ہے اور اسی ذریعہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں "رسول" ہوتا ہے۔ صاف الفاظ میں اس حقیقت کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے: عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ[2] (پ ۲۹ ع ۱۳)

---

[1] اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہے انہیں لیکن وہی

[2] غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں مگر کسی برگزیدہ پیغمبر کو۔

pragmatists [a] Positivists [b] Agnostics [c]

جب انسان غیب کے علم کو بذاتِ خود حاصل نہیں کر سکتا اور یہ علم صرف حق تعالیٰ ہی رسولوں کے ذریعہ عطا کر سکتے ہیں تو اب حقائقِ عالم یا جن کو فلسفہ کی اصطلاح میں "انتہائی حقیقت کا علم" یا "انتہائی علومِ حقائق" کہا جاتا ہے ان پر مطلع ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اللہ اور رسول پر ایمان لائے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ[1] (پ ۴ ع ۹)

غرض اس طرح انسان کے لیے انتہائی حقائق یا غیوب کو جاننے کا ذریعہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان ہے جس کے بغیر قرآن کی رو سے انسان روشنی سے قطعاً محروم رہتا ہے، اسی لیے فرمایا گیا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ[2] (پ ۱۸ ع ۱۱)

غیب کے علم کو جاننے کے ذریعہ سے محروم ہونے کے باوجود تجربۂ حواس کے ماوراء جانے اور حقیقت انتہائی کے حضور میں پہنچنے کی قابلیت سے قطعاً عاری ہونے کے باوجود جو لوگ اس کے متعلق لال بجھکڑوں کی سی اٹکل پچو غیر مقرر باتیں بناتے ہیں ان کو قرآن نے "خراصون" کے لقب سے یاد کیا ہے جس کے معنی

---

[1] اللہ تعالیٰ تم کو غیب کی خبر دینے والا نہیں ہے، البتہ جس کو چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے اس غیب کی اطلاع کے لیے انتخاب کرتا ہے، لہٰذا اگر تم غیب پر مطلع ہونا چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

[2] جس کو اللہ روشنی نہ عطا کرے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

"بے سند باتیں بنانے والوں" کے ہیں۔ ان کی باتوں کو "ظن و خرص" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی بات سننے اور ماننے سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور ضلالت کے کچھ نہیں: وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ[۱] (پ ع ۱)

اور قرآن کا کام ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ انسان کو جہل کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لاتا ہے: كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ[۲] (پ ۱۳ ع ۱۳)

جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی بات کی طرف سے اپنا منہ پھیر کر "انتہائی حقیقت" کو اپنے علم، عقل، کشف یا وجدان سے جاننے کی کوشش کی وہ ابتدائے فکرِ انسانی سے اب تک بھی اپنی غیر معمولی اور پیہم کوششوں کے باوجود صرف سوالات کے اٹھانے میں مصروف ہیں جن کا اب تک بھی انہیں کوئی تشفی بخش جواب مل نہ سکا، ان کے نزدیک یہ علم محض ایک "استفہامی علم" بن کر رہ گیا ہے، کوئی "سربستہ نظریہ"

---

[۱] دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا مانیں تو آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کردیں، وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔ ..... [۲] یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف یعنی خدائے غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لائیں۔

نہیں بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے! عقلِ انسانی کی اس حرماں نصیبی کو پیشِ نظر رکھ کر رومی نے فلسفی کے متعلق کہا تھا:

فلسفی گوید از معقولاتِ دوں　　عقل از دہلیز می نلید بروں!

فلسفی منکر شود در فکر و ظن　　گو برو سر را بداں دیوار زن!

فلسفی انتہائی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے، عقل کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے، فکر و اندیشہ کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا منہ خزانہ کی طرف ہے اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا منہ خزانہ کی طرف نہیں بلکہ اس کی پیٹھ خزانہ کی طرف ہے اور وہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے خزانے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت　　گو بدو کو راسوئے گنج است پشت

گو بدو، چنداں کہ افزوں می دود　　از مرادِ دل جدا تر می شود! (رومی)

فکر و استدلال سے جو کچھ فلسفی نے پایا ہے اس کو یہ دانائے راز مشک نہیں پشک قرار دیتا ہے، کیونکہ گو بظاہر بات مدلل اور قوی معلوم ہوتی ہے لیکن صداقت سے عاری ہوتی ہے:

مشک آلودہ است اما مشک نے　　بوئے مشکستش ولے جز پشک نے (مینگنی)

انتہائی حقیقت کا علم اگر حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ ہم ظن و تخمین، خوض و خرص کو چھوڑ کر (ذرھم فی خوضھم یلعبون) قرآن کریم اور ارشاداتِ نبوی کی طرف توجہ کریں جو مبدء ہیں علم حقیقی کا اور جو شک و ریب، قیاس و وہم، ظن و تخمین سے

منزہ ہیں۔ یہیں ہمیں وہ نورِ ہدایت حاصل ہو سکتا ہے جس کو عقلِ فطری ہمیں عطا نہیں کر سکتی: اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی؛ یہیں ہمارے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ ہے، یہیں بداہت و درایت کا جلوہ ہے؛ یہیں علمِ حقایق ہے اور یہیں طمانیت و تسکین! اسی کی ہمیں تاکید کی گئی ہے: وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ[۱] شاہ ولی اللہؒ نے اسی مفہوم کو خوب ادا کیا ہے:

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃِ نبی ست | واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکمِ وقت | تابع شدنِ حکیمِ خرد بولہبی ست

سطورِ بالا میں ہم نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ عالمِ سائنس نے اپنا موضوعِ تحقیق عالمِ مظاہر یا عالمِ شہادت کو بنایا، عقل و حواس کے ذریعہ اس نے فطرت کی یکسانیت، عمل اور قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی، اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر ہی کی جانب لگی رہی، مشاہدے اور تجربے کے ذریعہ اس نے ان قوانین کو دریافت کر لیا اور تسخیرِ قوائے کائنات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کے برخلاف فلسفہ نے کوشش کی کہ مظاہر کے عالم کے ماورا پہنچ کر "غیب" یا حقائقِ اشیاء کو معلوم کر لے اور چونکہ

---

[۱] یہ میری سیدھی راہ ہے تم اس کا اتباع کرو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

یہ کام عقل انسانی کی قدرت سے باہر ہے اس لیے فلسفہ محض ایک "استفہامی علم" بن کر رہ گیا جس کا کام صرف سوال کرنا ہی قرار پایا، اور عقل کو تنقید سے کبھی فرصت نہ مل سکی لہٰذا ع

رُست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دگر (اقبال)

اُدھر قرآن نے صاف طور پر جتلا دیا کہ غیوب کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے اور وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ انسان کو اتنا ہی علم عطا کرتے ہیں جتنا کہ وہ انسان کی دینی و دنیوی فلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اور قرآن کے بالاستیعاب مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ صرف اس غیبی علم کو رسولوں کے ذریعہ ہم پر منکشف کرتے ہیں جس کا جاننا ہماری عملی زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے، مفید اور نافع ہوتا ہے، اور وہ مافوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیاتِ انسانی کو حاجت نہیں اور اس کی عملی زندگی کی فلاح کے لیے ان کا علم ضروری نہیں، جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں، ان کو "وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ"[1] کہہ کر چھوڑ جاتے ہیں اور ان پر محض ایمان لانے کی تاکید کرتے ہیں!

جب غیب کا علم انسان کی عقل کی دسترس سے باہر ہے اور جب غیب کے متعلق حق تعالیٰ نے انبیاء ہی کے ذریعہ انسان کو علم عطا کیا ہے اور وہی علم عطا کیا ہے جس کے تحت میں کوئی عمل ہوتا

---

[1] اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہے تو پھر اہلِ حق کے یہ دو اصول منطقی طور پر لازم آتے ہیں اور جن کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

(۱) پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام عقائد و اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں ہو سکتی۔

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر سے متواتر جو کچھ ثابت ہے اور ان کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک اُنھوں نے تفسیر و تشریح کی ہو اسی پر ایمان لانا واجب ہے اور اپنی عقل و قیاس و استنباط سے تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہیں اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزء ہے[1]

ان عقائد و اعمال کے متعلق جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے ان میں اضافہ یا کمی کرنا، یا ان کی عقل و قیاس سے توجیہ و تعبیر کرنا اس امر کا دعویٰ کرنا ہوگا کہ ہم براہ راست اپنی عقل یا وجدان کے ذریعہ ان غیبی علوم کو حاصل کر سکتے ہیں، ہمیں کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں، ہم سارے پیغمبروں کی آمد و بعثت سے مستغنی ہو سکتے ہیں!

اہلِ حق نے ایسا نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے ہمیشہ اپنی عقل کو پیغمبر اسلام کی عقل پر قربان کر دیا اور حسبی اللہ کہہ کر حق تعالیٰ

---

[1] دیکھو رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈھ ص ۳

کی بات پر ایمان لائے اور اپنی زبان روک لی اور کہا تو صرف یہ کہا کہ

عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفےٰ ۔۔۔ حسبی اللہ گو کہ اللہ ہم کفےٰ

زیں خرد جاہل ہمیں باید شدن ۔۔۔ دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ۔۔۔ ایں عسس را دید و در خانہ نشد (رومی)

اسلام میں یہ اہل السنۃ والجماعت ہی کا طبقہ ہے جنہوں نے عقائد میں گفتگو کو ہمیشہ ناپسند کیا اور "اٰمنّا بہٖ کلٌّ من عند ربّنا" کہہ کر ایمان لائے اور جادۂ مستقیم پر قائم رہے۔ ان کے عقائد وہی رہے جو پیغمبر اسلام اور ان کے صحابۂ کرام کے تھے، اسی لیے انہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ "علم اللہ" کے تابع ہیں "ہویٰ" کے پیرو نہیں، یہ "مستِ خدا" ہیں، بالغ ہیں اطفال نہیں!

خلق اطفال اند جز مستِ خدا ۔۔۔ نیست بالغ جز رہیدہ از ہویٰ (رومی)

امام مالک بن انس رض "اہل السنۃ" کا عقیدہ ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

الکلام فی الدین اکرہ و	میں عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا
لا یزال اھل بلدنا یکرھونہ	ہوں اور ہمیشہ ہمارے شہر (مدینہ) کے
وینھون عنہ نحو الکلام	علماء اس کو ناپسند کرتے رہے ہیں اور
فی رای جھم والقدر و	اس سے روکتے رہے ہیں۔ مثلاً جہم
ما اشبہ ذلک ولا احب	کی رائے اور قدر میں گفتگو کرنا۔ میں بحث
الکلام الا فیما تحتہ عمل،	و مباحثہ ان امور میں ناپسند کرتا ہوں،
فاما الکلام فی دین اللہ	جن کے تحت میں کوئی عمل نہ ہو لیکن خدا کے

وفی اللہ عز وجل فالسکوت احب الیّ لانی رایت اہل بلدنا ینہون عن الکلام فی الدین الا فیما تحتہ عملہ[۱]

عقائد اور خود خدا کی ذات میں سکوت میرے نزدیک پسندیدہ ہے، کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے علماء کو دیکھا ہے کہ عقائد میں گفتگو کرنے سے رد کتے تھے سوائے ان امور کے جن کو عمل سے تعلق ہو۔

امام مالک کے ان الفاظ سے نہ صرف ان کے اصول کی صراحت ہوتی ہے بلکہ ان سے سلف کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے، عمل نہ کہ تخیل اُن کا مطلوب و مقصود تھا!

"رہ عاقلی رہا کن کہ بادتواں رسیدن
بدل نیاز مندے بہ نگاہِ پاکبازے" (اقبال)

امام ترمذی ائمہ سنت کا اصول بتاتے ہیں:

والمذہب فی ھذا عند اہل العلم من الائمۃ مثل سفیان الثوری و مالک بن انس وسفیان بن عیینہ وابن المبارک

ائمہ اہل علم جیسے سفیان ثوری، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک وغیرہ کا اس بارہ میں مذہب یہ تھا کہ انہوں نے ان چیزوں کی روایت کی اور کہا ہم حدیثوں

---

[۱] جامع بیان العلم ابن عبدالبر منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ صفحہ ۴۳

و وکیع وغیرهم انهم رووا هذه الاشیاء وقالوا نروی هذه الاحادیث و نؤمن بها ولا یقال کیف وهذا الذی اختاره اهل الحدیث ان یروی هذه الاشیاء کما جاءت ویؤمن بها ولا تفسر و لا یتوهم ولا یقال کیف وهذا امر اهل العلم الذی اختاره وذهبوا الیہ[1]

کی روایت کرتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ نہیں کہا جائے کہ یہ کیوں کر رہے ہیں اور اسی مذہب کو اہل حدیث نے اختیار کیا ہے کہ ان باتوں کی روایت کردی جس طرح پر وہ آئی ہیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور ان کی تفسیر نہ کی جائے اور نہ وہم کیا جائے اور نہ "کیسے" کہا جائے۔ اہل علم کا یہی مذہب ہے اور اسی کو انہوں نے پسند کیا ہے۔

عارف رومی نے اس مسلک کو یوں ادا کیا ہے اور اس کی دلیل بھی پیش کی ہے ؎

عقل را قرباں کن اندر عشق دوست ۔۔۔ عقل ہا باری ازاں سوئیست کوست
اے ببردہ عقل ہدیہ تا الٰہ ۔۔۔ عقل آنجا کمتر ست از خاکِ راہ
عقل چوں سایہ بود حق آفتاب ۔۔۔ سایہ را با آفتابِ او چہ تاب
عقل چوں شحنہ است چو سلطاں رسید
شحنہ بیچارہ در کنجے خزید (رومی)

---

[1] جامع بیان العلم ابن عبد البر از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ ص ۴۱

اس بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اہلِ سنت کا رویہ "خلافِ عقل" ہے اور اس لیے وہ مذہب میں عقل کی مطلق دخل اندازی جائز نہیں رکھتے۔ بات صرف اتنی ہے اور اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے، کہ جب عقل ماورائے حواس جا نہیں سکتی اور حقائقِ اشیاء کا علم حاصل نہیں کر سکتی، جو غیب کا دائرہ ہے اور عقل کی دسترس سے باہر، تو پھر عقلی طور پر یہی لازم آتا ہے کہ عقل کو بیکار محض نہیں بلکہ محدود قرار دیا جائے، اس کی تحقیر نہ کی جائے بلکہ اس کی قابلیت اور قدرت کی تحدید کر دی جائے اور اس کا اصلی دائرہ عالمِ مظاہر یا شہادت قرار دیا جائے نہ کہ عالمِ غیب۔ جس طرح بصارت ایک خاص فاصلہ کے آگے نہیں دیکھ سکتی اور سماعت اپنے عمل کے لیے ایک مخصوص دائرہ چاہتی ہے جس کے بعد وہ بیکار رہے اسی طرح عقل انسانی کا بھی ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں وہ عمل کرتی ہے اور اس سے باہر وہ قطعاً بیکار ثابت ہوتی ہے۔ یہ دائرہ واقعات تجربہ کا دائرہ ہے، اس سے ماوراء عقل جا نہیں سکتی۔ قرآن نے جن غیبی حقائق کو پیش کیا ہے وہ قطعاً خلافِ عقل (Contra-rational) نہیں، وہ "ماوراء طورِ عقل" ہیں (Supra-rational) جس دائرہ میں عقل قدم زن نہ ہو سکتی ہو، جس دائرہ کا علم حق تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ ہی عطا کرتے ہوں اس دائرہ میں ہم کو اپنی عقل کی روشنی

سے نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے ہی سے چلتا چاہئے کر اپنی عقل کو علمِ الٰہی کے تابع کرنے کے معنی بے عقل یا پاگل ہونے کے نہیں، خلافِ عقل راہ چلنے کے نہیں بلکہ بقول عارف رومی ہمہ تن "سرو عقل" ہونے کے ہیں :-

"زیں سراز حیرت گرایں عقلت رود
ہر سر مویت سرو عقلے بود"

کیونکہ ہماری عقل 'جزئی' ہے اور حق تعالیٰ کی عقل 'کلی'، ہماری عقل جزئی ہونے کی وجہ سے 'کل' کا علم حاصل نہیں کر سکتی، اپنی تقیید وتحدید کی وجہ سے وہ کل حقیقت کی گرفت سے قاصر ہوتی ہے، اس کا علم جزئی، اضافی یا اعتباری ہوتا ہے اور حق تعالیٰ ہی کا علم مطلق ہوتا ہے۔ ہم اپنی عقل کو 'عقل کلی' کے تابع کر دینے سے اس علم کے بھی سرمایہ دار ہو جاتے ہیں جس کو ہماری عقل بذلت خود حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ عقل جزئی تابع وحیِ الٰہی ہو کر عقل 'خود بیں' نہیں رہتی عقل "جہاں بیں" ہو جاتی ہے۔ ان دونوں عقلوں کے فرق وتفاوت کو اقبال نے نہایت فصیح الفاظ میں بیان کیا ہے :-

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آں کہ برد دانۂ افتادہ زخاک
آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آں کہ زند سیر چمن مثلِ نسیم
آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے
ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست!
(پیامِ مشرق)

حکمتِ ایمانیاں کے ان بنیادی بصائر کو تمہیں سمجھا دینے کے بعد اب ہم تمہیں "حکمتِ یونانیاں" کی طرف لے چلتے ہیں "حکمتِ ایمانیاں" سے تمہارا قلب منور ہونے کے بعد عقلِ خود بیں، کا غلام نہیں بن سکتا۔ قلبِ سلیم یا عقلِ جہاں بیں سے اب تم حکمتِ یونانیاں، یا عقلِ خود بیں کی پاتنت پر نظر ڈالو۔

فلسفہ کیا ہے؟[1]

"نامد خبرے کہ از کجائیم ہمہ
وز بہر چہ در حیات پائیم ہمہ
چوں ذرۂ خاک می رویم آخر
پس ما بہ سرِ خاک چرائیم ہمہ
(بو علی قلندرؒ شرف)

فلسفہ؟ وہی تجریدات کا گورکھ دھندہ؟ وہی لِمَ ولا نُسَلِّم کا دعویٰ؟ وہی اثیری تخیلات جو منّت کشِ معنی نہیں؟

اُلجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث و مباحثہ ہی کا نام ہے، جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کی جاتی ہے، یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو؟ سب جانتے ہیں کہ علمِ ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے، جہاں احساس ارادہ اور عقل کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے۔ "خود را بشناس" کی حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مردافگن کیوں ہوتا ہے، عقل ان کے شر و شور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شعور کے کیا معنے ہیں،

---

[1] یہ مقالہ اور بعد کے دو مقالات اول مرتبہ برہان میں اگست ستمبر اکتوبر سنہ ۴۲ء میں شائع ہوئے۔

تسلسلِ ذات سے کیا مُراد ہے، وغیرہ۔ بہر حال یہ تمام علوم واقعات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ واقعات نہایت اہم و دلچسپ ہیں، علمی و عملی لحاظ سے ان کا فائدہ مسلّم ہے، لیکن فلسفے میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے؟ استدلالیوں کی یہ چناں و چنیں، یہ لم و نسلّم آخر کس چیز کے متعلق ہے؟ کیا ہم نے نہیں سُنا کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود؟

سوال بالکل جائز ہے، اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ آپ سچ بتلائیے کہ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص و متعین حالات کے مطالعے سے کبھی نہ کبھی بیزار یا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ "صد کتاب و صد ورق در نار کن" یہ نہ پوچھا ہو کہ آخر یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہے؟ اس جھگڑے کا انجام؟ اس کی قدر و قیمت؟ اس کے معنے و مقصود؟

"نیست فائدہ در جہاں بے فائدہ چیست؟"

جب آپ اس دنیا کے مخصوص و متعین واقعات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنے و مقصود، اس کی قدر و قیمت و اہمیت اور فرد و عالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں

کو "آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے" قرار دیتے ہیں۔

براؤننگ کہا کرتا تھا کہ زندگی معنے رکھتی ہے اور اسی معنے کا دریافت کرنا میری غذا، میرا کھانا پینا ہے۔ براؤننگ فلسفی تھا فلسفے کی یہی تعریف ہے کہ یہ "معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے" یہ حیات کی "توجیہہ و تعبیر" ہے۔

فلسفی حیات من حیث کل کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس کا نقطۂ نگاہ وسیع ہوتا ہے وہ کسی خاص محدود نقطۂ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بہ قول فلاطون "سارے زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے" کسی شے پر فلسفیانہ طور پر نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہ میں وسعت ہو، اس شے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو۔ ہم اس کی توجیہ میں ڈاکٹر جانسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کرینگے جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جانسن اور اس کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لانڈ لارڈ نے اس کو اپنی انتہائی بدمذاقی سے مکان پر زیادہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آزردہ خاطر ہوا، اور جانسن کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ جانسن نے یہ سن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے خاص انداز میں کہا کہ "جناب ذرا سوچیے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ مہینے بعد کس قدر

حقیر معلوم ہوگا!" جانسن فکر و نظر کی رو سے نہ سہی، کردار و عمل کے لحاظ سے پکا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بیشمار واقعات پیش آتے ہیں اور یے گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجہ کو مرکوز کرنا اس کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے، نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعاتِ عالم کو اپنے اپنے تناسب کے لحاظ سے دیکھتا ہے۔ کل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے۔ جانب داری، تعصب، تنگی اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بالفاظ دیگر وہ زندگی کو کلیت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

بعض دفعہ فلسفے کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں"

ہماری اس مانوس دنیا کو جس میں ہماری بود و باش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج و تعمیمات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس کے زمانے سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے اب تک فلسفے کی غایت رہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر "دنیا" سے مراد کیا ہے؟ یونان کے اہل نظر دنیا یا کائنات کو ہم معنی سمجھتے تھے، اور ہر زمانے کے فلسفیوں نے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی

کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا۔ کسی فلسفیانہ مزاج شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی ایک دل ہے جہاں تو سما سکے

تو پھر کائنات کی وسعت دہر و دیعنی مکان و زمان کی نوعیت کیا ہے، اس لامتناہی زمان و مکان والی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد و غایت کیا، اس کا مایۂ خمیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منتہا سے تعلق کیا ہے؟ یہ وہ انتہائی و ابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دیمقراطیس اور فلاطون اور ارسطو، سینٹ اگسٹائین برونو، ڈیکارٹ، سپنوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربرٹ اسپنسر، اور دیگر اکابر فلاسفہ نے اپنی جانیں دیں اور یہی عظیم الشان سوالات اب تک قابل غور ہیں اور وارفتگانِ عقل کے لیے ہمیشہ رہینگے!

موجودہ زمانے میں ہمارا نقطہ نظر زیادہ تر انفرادی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر ہیئتی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشری، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں قدمائے یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا، لیکن تغیر سے ان کی مراد مادی تغیر تھا یعنی مادی ذرات یا اجزاء کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر۔ چنانچہ زینو کا خیال

تھا کہ قدرت کے کارخانے میں تغیر محال ہے، جو اس کو بہ ظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب والتباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کا نقیض تھا کہ ثبات وسکون کائنات کی کسی شئے میں نہیں، دنیا سرتا پا تغیر، تجدد، تنوع ہے۔ یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں، لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہوگئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علائق، اخلاق و آداب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کی تغیرات والی دنیا، لہذا فلسفے کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات، اس کی قدر وقیمت، اس کی بدایت ونہایت وغرض وغایت کی توجیہ کرتا ہے۔ اس لیے ارتقاء، ترقیٔ ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہونگے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادہ اور انرجی کے کوئی شئے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہوسکتی ہے؟ اگر

جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادے سے جدا نہیں؟ میرا غور و فکر کرنا، اور درد و الم سہنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے؟ مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شئے ہے؟ میں زندہ ہوں، حیات کیا ہے؟ وہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر او نکو تر ست"؟ ایک روز مجھے موت آئیگی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابو العتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا

الموت باب وکل الناس یدخلہ ؎
یالیت شعری بعد الباب ما الدار؟

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ع
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!

حافظ کا خیال تھا کہ ع پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند! واقعہ کیا ہے؟ مجھ سے، آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں کے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب و خطا کے کیا معنے؟ ان کے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاشِ زر میں سرگرداں ہیں، بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور ع خوش باش دمے کہ زندگانی این است، کے پیرو

؎ موت ایک دروازہ ہے، جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے۔ اے کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد مکان کونسا ہے!

کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں؟ ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں؟ مثلاً رواقیہ نے "طمانیتِ نفس" کو خیر برتر قرار دیا تھا، دنیا کی کوئی مصیبت، دنیا کی کوئی خوشی 'اطمینانِ خاطر' کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی، چنانچہ بی کھیوس نے روما کے جیل خانے میں "فلسفہ کے تسلی بخش لذات" پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اسی طرح محبت، فرض، تلاشِ حق، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جاسکتیں؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟ علم انسانی کے حدود کیا ہیں؟ اس کی اڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوب صورت اشیاء ہمیں احاصرہ کیے ہوئے ہیں، اکثر بد صورت بھی ہیں حسن کیا ہے؟ ایک خوب صورت عمارت میں، ایک حسین چہرے میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت لباسِ حسن سے ملبوس ہوتی؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ان پر غور و فکر کرنا، حکیمانہ طور پر، تدقیق و تحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا، گو یہ سعیِ لا حاصل سہی، فلسفہ ہے یا جیسے فلسفے کے شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے "فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے" یہ کلام

دیوتاؤں کا نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا!

ان سوالات کا مبدء تجسس و استعجاب ہے، انسان کی وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو فلاطون نے فلسفہ کا مبدء قرار دیا ہے۔ فلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفے کے لیے وقف کردی تھی، لیکن ہمارے مقابلہ میں ان کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر سادہ اور طفلانہ تھا، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا، وہ دنیا کی ہر شے، ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب و تحیر نے ان کو فلسفے کی راہ پر لگا دیا، اس زاویۂ نگاہ سے ہم فلسفے کی اس طرح تعریف کرسکتے ہیں کہ "یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ و متین فکر کی صورت اختیار کرلیتا ہے"

ایک چھوٹی لڑکی دریچے سے منہ نکال کر غور و خوض کے ساتھ راہ روؤں کی وارفتہ حرکات دیکھ رہی تھی، ایک دم وہ پلٹی اور اپنی ماں کے منہ سے منہ ملا کر پوچھنے لگی۔ "اماں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تم ہی بتادو کہ یہ سب لوگ کہاں سے آئے، یہ دنیا کہاں سے آئی؟" اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے!

ہم میں سے بہت سارے بچے اور بڑے، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے، جیسی بھی ہو قبول کرلیتے ہیں، بہ قول رابرٹ لو

اسپینوزا اس کو دوا کی گولی کی طرح نگل جاتے ہیں، لیکن بعض غور وفکر کرنے والے ہوتے ہیں، انہیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز و انجام نامعلوم ع اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست، وہ اس کی بدایت و نہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ ے

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم کجا بودم
دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم!

فلسفے کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنے "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو فلسفی کہتا تھا یعنے "طالبِ حکمت" جو انسان کی غرض وغایت وجود اور اس کے فرائض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا۔ ارسطو کے نزدیک انسانی عقل حکمتِ الٰہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلّی ہے، ہماری عقل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ یہ بھی کلّی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون اور ارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالبِ حکمت" کہتے تھے، اور فلسفے کے اس لفظی معنے کے لحاظ سے ہر عاشقِ حکمت فلسفی کہلایا جا سکتا ہے:۔

فلسفے کی اس عام تعریف و توضیح سے جو سطور بالا میں کی گئی، آپ کو فلسفے کے معنے دل نشین کرنے میں مدد ملی ہوگی۔ اب ہم چند اکابر فلاسفۂ یونان کے الفاظ میں فلسفے کی مختلف تعریفات

پیش کرتے ہیں۔ فلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو سے زیادہ مغربی تہذیب پر شاید کسی اور مفکر کا اثر نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ ان عظیم المرتبت فلسفیوں نے فلسفے کی کیا تعریف کی ہے۔ فلاطون فلسفے کو (سقراط کی طرح) محبتِ حکمت یا محبتِ علم قرار دیتا ہے جو محض رائے زنی یا ظن کی محبت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے نزدیک فلسفی وہ شخص ہے جو اشیاء کے عین و حقیقت سے واقف ہوتا ہے، ظواہر و التباساتِ حواس میں مبتلا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اپنے مشہور و معروف مکالمۂ جمہوریت میں لکھتا ہے:

"جن لوگوں کو مطلق و سرمدی و عدیم التغیر کی یافت ہوتی ہے، انہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ "علم" رکھتے ہیں نہ کہ محض "رائے یا ظن"۔ لہٰذا فلسفی وہ لوگ ہیں جو "اس شئے سے دل لگاتے ہیں جو ہر حالت میں فی الحقیقت وجود رکھتی ہے"۔ سرمد نے اپنی زبان میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے ؎

دنیا نکنم طلب کہ کمتر زخس است | بے دولتِ دیدارِ تو دیں ہم قفس است
خواہانِ وصالم و ہمیں ست سخن | در خانہ اگر کس ست یک حرف بس است

فلاطون کی رائے میں علم کا سچا شیدا "صداقت کے حصول میں سعیِ بلیغ سے کام لیگا" ان کا قلب تنگ نظری، بزدلی، حرص،

کمینہ پن، ادعا جیسے صفات ذمیمہ سے پاک ہوگا اور تیزی فہم، حافظۂ قوی، شجاعت و عدالت جیسے صفات سے متصف ہوگا۔[۱]

فلسفے کے متعلق ارسطو کا خیال فلاطون کے خیال سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک بھی فلسفہ محبتِ حکمت ہے علم ہی کی خاطر علم سے محبت فلسفہ ہے۔ فلاطون کی طرح ارسطو نے بھی 'حیرت' کو فلسفے کا مبدء قرار دیا۔ چنانچہ ابتدائی فلاسفۂ یونان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "ابتداءً انہوں نے ظاہری مشکلات پر حیرت کی، پھر رفتہ رفتہ وہ آگے قدم بڑھاتے گئے اور عام معاملات کے متعلق مشکلات کو پیش کیا"۔ ارسطو جس چیز کو فلسفۂ اولیٰ کہتا تھا وہ ان دنوں 'مابعد الطبیعات' کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف ارسطو نے اس طرح کی تھی: فلسفۂ اولیٰ علل اولیہ و اصول اولیہ سے بحث کرتا ہے" عملی علم بلکہ جملہ سائنس بھی جو جزئیات سے بحث کرتے ہیں، جو اس سے بالکل قریب ہوتے ہیں۔ لہذا ان کا زیادہ آسانی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ علم افادی مقاصد کے حصول کے لیے سیکھا جاتا ہے۔ لیکن علل و اصولِ اولیہ یا کلیات "انسان کے علم کے لیے سب سے زیادہ سخت ہیں" کیونکہ یہ حواس سے بعید ترین ہیں اور ان کی تلاش وہی لوگ کرتے ہیں جو علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

---

[۱] دیکھو "ریپبلک" مترجمہ جووٹ صفحہ ۴۸۰ و ۴۸۴ و ۴۸۵ و ۴۸۷ وغیرہ

ابتدائی یونانی، رومی عہد میں دو اور فلسفیانہ نظامات پیدا ہوئے جو رواقیت و ابیقوریت کہلاتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں سیاسی اور معاشری اختلال پایا جاتا تھا اور ہر سو ہراس و ابتری پھیلی ہوئی تھی اس لیے رواقیہ اور ابیقوریہ کی زیادہ تر دلچسپی حیات انسانی کی قدر و قیمت سے وابستہ ہو گئی۔ معاشی و سیاسی اداروں کی تباہی اور مذہب و اخلاق کی بربادی کو دیکھ کر انہوں نے یہ سوالات اٹھائے: "ہماری زندگی کی کیا غرض و غایت ہے؟ انسان اپنی زندگی کو کس طرح سدھارے؟ حقیقی قدر و قیمت کی کونسی شے باقی رہ گئی ہے جس کی تلاش و حصول میں انسان اپنی زندگی بسر کرے؟"

اے کاش بدانمے من کیستمے | سرگشتہ بہ عالم زپے کیستمے
گر مقبل و آسودہ زخوش زیستمے | ورنہ بہزار دیدہ بگریستمے!

(حاشیہ: خیام)

رواقیہ و ابیقوریہ کو علوم نظریہ، نفسیات و منطق میں صرف اسی حد تک دلچسپی تھی جس حد تک کہ یہ علوم ذات انسانی اور کائنات سے اس کے تعلق کو سمجھنے میں مدد دے سکتے تھے۔ ان علوم کی مدد سے وہ حیات انسانی کے معنے اور اس کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔ رواقیہ نے کہا کہ "حکمت" انسانی اور الٰہی چیزوں کا جاننا ہے۔[1]

---

[1] دیکھو بیکول کی کتاب Source Book of Ancient Philosophy صفحہ ۲۶۹۔

غرض رواقیہ کے نزدیک فلسفہ نیکی یا فضیلت کو حاصل کرنے کی کوشش ہے جو انفرادی زندگی کو دانائی و حکمت کے ساتھ فطرت کے الٰہی نظام کے ماتحت کرنے اور طبیعیات، منطق و اخلاقیات کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے ۔

خواہی ز وصال شادماں دار مرا   خواہی ز فراق در فغاں دار مرا
من بہ تو نگویم چساں دار مرا   زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا

رواقیہ کے برخلاف ابیقوریہ کا یقین تھا کہ مسرت غایت حیات ہے، انسان کو اپنی دو روزہ زندگی مسرت و اطمینانِ قلبی کے ساتھ بسر کرنی چاہیے ۔

خوش باش دمے کہ زندگانی اینست

ایپکورس انسان کو جذبات کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے اور اس کے قلب میں وہ طمانیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کو دنیا کی کوئی شئے برباد نہیں کر سکتی۔ لہذا ابیقوریہ کے نزدیک فلسفہ مسرت کی عقلی تلاش کا نام ہے ۔

دورانِ فلک روز و شباں می گزرد   بس دور گزشت ہمچناں می گزرد
از بہرِ دو روزہ عمر دل تنگ مباش   اے غنچہ شگفتہ شو جہاں می گزرد

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفے کے مقابلے سے فلسفے کے نئے معانی پر روشنی

پڑ سکتی ہے۔ اکابر شعراء میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں، لیکن بعض اس کی توجیہ و تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بدایت و نہایت، غرض و غایت، نوعیت و ماہیت کی تشریح کرتے ہیں۔ یہی فلسفی شعراء ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکریشیس فلسفی تھا، اپیکورس کے فلسفے کو اس نے شعر میں ادا کیا، الٰہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت، "ماہیت فطرت"[۵] والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرارِ ازل، ماہیت کائنات، غایت وجود راز مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے لیے نہیں تاہم تخیل کے لیے نہایت خوش گوار ہیں:۔

اسرارِ ازل را نہ توانی و نہ من | ایں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو | چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

دیگر

در چرخ بانواع سخنہا گفتند | ایں بے خبراں گوہرِ دانش سفتند
واقف چو نگشتند باسرارِ فلک | اول زنخے زدند و آخر خفتند

دیگر

خیّام اگر بادہ پرستی خوش باش | با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبتِ کارِ جہاں نیستی ست | انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

---

۵ De Revum Natura

ڈانٹے بہت بڑا فلسفی شاعر ہے۔ وہ اپنی Divine Comedy میں ہمیں کائنات کی شکل و صورت سے، انسان کی بدایت و غایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے "فردوس" (Paradiso) کے تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلبِ کائنات سے حُبِ الٰہی کی مستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی نجاتِ انسانی ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقوے سے نہیں، تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ کو اس "ناقابل فہم عالم کے بارگراں" نے عاجز کر رکھا تھا اور براوننگ "نباض قلب" خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے۔

ان فلسفی شعرار کی حیرتناک دلکشی اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینے میں اسرارِ ازل کو دریافت کرنے اور اس "حرفِ معمہ" کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعرار کے کلام سے کس قدر تسلی اور آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کہہ اُٹھتے ہیں۔ ایچی لس، سوفوکلیس، یوری پڈیس سب کے سب حاملِ پیغام، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انہوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا۔

زمانۂ حال میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامے کس قدر فلسفیانہ

بنے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے اُلجھ کر انہیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِبسن اس نئے ڈرامے کا منبع ہے، جہاں بجائے شاعر و صنّاع کے مفکّر و معلّم کا کام کرتا ہے۔ اِبسن قدامت کی از کار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامے کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفلسف کے کچھ نہیں۔ اِبسن، برنارڈ شا، گالس ورتی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرتناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں و جویا ہیں۔ بقول ایک فلسفی کے[1] "ہم مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں" ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکشِ حیات کے باطنی اصول کیا ہیں، یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے کیا انتخابِ فطرت کورانہ ہے یا کوئی "دستِ غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہر حال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں جو زندگی کے مسائل ہیں ہمیں اب بھی دلچسپی ہے اور یہ روز بروز افزوں ہوتی جا رہی ہے۔

---

[1] شوپنہور۔

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالینگے، اختصار ہمارے پیش نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے دونوں کا مبدءُ و مادی وہی ایک ہے، "حُبِ علم" ان کی بتدا اور "علمِ حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب یہ خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علم علوم مخصوصہ، خصوصاً ریاضیات، طبیعات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر روز وسیع ہوتا جارہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لیے آسان نہیں، اسی لیے فی زمانناً فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر کلیات کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کررہا ہے۔ تاہم صحیح معنی میں فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو۔

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے جو 'علم' کے ہم معنی ہے، حکیمانہ علم "متیقن، صحیح اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے" فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہذا فلسفہ اور

سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے، اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Describe) کرنا ہے اور فلسفہ کا کام ان کی توجیہ و تعبیر ہے (Interpretation)۔

جے آر تھر ٹامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ:

"سائنس واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں
کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہر عالم کے ایک مجموعے کا عالم سائنس مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحلیل کرتا ہے، ان کو ترکیب دیتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط (یا علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالے کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس نے واقعات تجربیہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرز وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا۔ سائنس کی اسپرٹ برخلاف عملی و جذباتی پہلو کے مندرجۂ ذیل خصوصیات سے متصف ہوتی ہے:-

ا۔ واقعات اور صداقت کی بے غرضانہ تلاش۔
ب۔ تجربے کی طرف مسلسل توجہ۔
ج۔ بیان میں حزم و احتیاط
د۔ بصیرت کی صفائی
ہ۔ اشیاء کے باہمی ربط کا خیال۔

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو متیقن، صحیح اور مربوط و منضبط ہو۔ لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جس میں جامعیت اور استیعاب ہو مظاہر کے غیر مبدل توالیات، یا قوانین کا تعین ذہن انسانی کی پوری طرح تشفی نہیں کر سکتا۔ وہ اشیاء، یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے، یعنی وہ ان کی علت اولیٰ، ان کی بدائت و غایت ان کے معنی یا قدر و قیمت کا جویا ہوتا ہے سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط یا بیان پیش کرتی ہے، لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے زمانہ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اس چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے: "فلسفہ مختلف علوم و سائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی و اخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بحیثیت مجموعی غور و فکر کرتا ہے۔ اُمید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقے سے کائنات کی کنہ و ماہیت، خود اپنی

حیثیت و مقام کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کرسکیں (براڈ)

اس میں شک نہیں کہ فلسفے کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کی عالمگیر وسعت ہی کی بنا پر علمائے سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے، ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کرسکتا اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کرنے کی کوشش کرینگے لیکن یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذاتِ خود مورد اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معروض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کیے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کیے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفے کے مطالعہ کے وقت نہیں کیا گیا، لیکن ہم آگے چل کر بتائینگے کہ خود سائنس کے مطالعہ میں بھی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا۔ فکلا ہما سواء۔

بہرحال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکرِ انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اول دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی مقصد یا غایت اور قدر و قیمت پر غور و فکر ثانیاً

سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں پہلے کو فلسفۂ نظری کہا گیا ہے اور دوسرے کو 'فلسفۂ انتقادی'

مقصد اول کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ذہن انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفے کے لیے مخصوص ہے ہمیں دنیا کا محض ایک کمّی نقطۂ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علائق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیت ("اسرارِ ازل") کا علم مطلوب ہے۔ اس زمانہ میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی تحقیقات ہو رہی ہے ان سب میں کمّی علائق پر زور دیا جا رہا ہے سب 'کیف' کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول اور تحقیق و تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطۂ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنے و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہی، لیکن اس کا تکملہ فلسفے سے کیا جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ دنیا میں نہ مقصد ہو نہ غایت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو۔ لیکن اس نتیجے تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہنچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے۔

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض

ایسے کلی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پرتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لیے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زمان، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر وغیرہا سے دی جا سکتی ہے۔ اب فلسفے کا یہ مخصوص کام ہے کہ اِن تصورات کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیعاب سمجھنے کوشش کرے۔ بہ قول جی آر ٹھامسن کے "مقولات (تصورات) و مسلمات کی یہ تنقید وہ اہم خدمت ہے جو مابعد الطبیعیات سائنس کے حق میں بجا لاتی ہے" برٹرنڈرسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفے کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت اصطلاحی چیز ہو گئی ہے اور ہم سر دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔

فلسفہ اور مذہب

ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لیے غور کر رہے ہیں کہ فلسفے کی اہمیت اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اُجاگر ہو جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مندرجۂ ذیل مختصر واقعات

سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکینگے:

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا، اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جداگانہ ہے۔ فلسفہ کائنات من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے۔ فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنے سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد اور عالم کی حقیقی وحدت اور ان کے وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدء عالم کے ساتھ ایک ہو جانے کی ہوتی ہے ہم اس میں محو ہونا چاہتے ہیں اور اس طریقے سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیتِ نفس و جمعیتِ خاطر بخشنا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ بھی ہمارے علم میں پہنائے عالم پیدا کرنے اور لذتِ وقوف بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی غایتِ مشترکہ قرار دی جا سکتی ہے لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا

ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر یہ علم کو عملی و اقتصادی اغراض کے تحت رکھتی ہے۔ فلسفے کی غرض محبت علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت ہوتی ہے۔ مذہب کائنات کو اس لیے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسانی کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً روح، اس کی بدایت و غایت، خدا اور تخلیق، لیکن یہاں بھی ان دونوں کے اغراض جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی اور شخصی!

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے، فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مذہب زندگی کے ذہنی، جذباتی و حسّی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ پہلو ابتدا ہی سے عادات و وجدانات میں مضبوطی پکڑ لیتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل پیدا کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنی کا تعین تو ضرور ہو سکیگا۔ مذہب پر جب آپ غور

کرتے ہیں تو شاید ائتلاف کی وجہ سے مسجد و حرم، دیر و کلیسا، مصلیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں اور ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہنچ سکینگے، شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو:۔

"مذہب غیب کی ان قوتوں پر آسرا کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے[1]۔ یا مذہب ایک غیر مرئی روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے۔"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفا شعاری کا احساس ہے۔" ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں ناقص 'میں'، اپنے کامل 'میں' کی پرستش کرتا ہوں"۔ ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعلیٰ قیمتوں کے عمیق جبلی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جلالیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماورا اور سارے

---

[1] جے۔ بی۔ پراٹ کی کتاب Religions Consciwness صفحہ ۱۔ مطبوعہ میکملن کمپنی ۱۹۲۰ء

عالم پر محیط ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دنیا اور اس کے آلام و لذائذ سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہی اسی بنا پر ونٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہینگے جو ایک نصب العینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"

اسی وجہ سے مذہب کے اسماء، علائم و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں، دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماوراء ہیں، اور اسی لیے مذہبی پہلو وفا شعاری، تکریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے۔

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا سرّ و غموض نہیں پایا جاتا۔ یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلیٰ قیمتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ جارج سنیٹانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے، ڈریک نے اپنی کتاب "مسائل مذہب" میں روحانیت کے معنے اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے:۔

"قلب و ارادے کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پرواکرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی

واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ
سے "روحانیت" کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں
اور اداروں میں رونما ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں
پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو مذہب کہتے ہیں"[1]

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ یا پُراسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ ایک حاجتمند روح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرۂ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور ان میں دنیا کے لذائذ و رغائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا، اس لیے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شئے ہے۔

مذہب اور فلسفے کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روح انسانی میں ہمیشہ

---

[1] "مسائلِ مذہب" صفحہ ۲۴۴۔

موجود ہوتی ہیں، لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں تو پھر فلسفے کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء و ماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتداء میں فلسفے کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ "معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے"۔ اور اگر مذہب روحِ انسانی کا کائنات کی اعلیٰ قوتوں کو لبیک کہتا ہے تو فلسفے کا کام یہ ہوگا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے، یا اگر مذہبی پہلو کے لیے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی الٰہی قوت ہے جو فطرت انسانی سے کوئی نہ کوئی شے مشترک رکھتی ہے جس کو ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں، تو فلسفے کا یہ فریضہ ہوگا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً فلسفے کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے خصوصاً ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ نا قابل مصالحت ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور اُنہیں تقویت بخشتا ہے بیکن نے کہا ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب

مائل کرتا ہے، لیکن فلسفے میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کر دیتا ہے" دراصل فلسفہ کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی "بنیانِ مرصوص" پر مستحکم طور پر قائم کر دے تاکہ جبلی تیقنات اور "دین العجائز" مادیت والحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلی احساسات مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "تجس" سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد کر دے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک و ریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے، خوف رفع ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا۔ وہ اپنے پورے خد و خال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی پھر ہمیں جو طمانیت و سکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے۔

فلسفے کے امکان کا سوال

فلسفے کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا، "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو متشکل کیجیے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی و مقصود، اس کی ہدایت و نہایت، حیات کی قدر و قیمت، یہ ایسے عظیم الشان

سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا اور کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالم سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لیتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرۂ بحث کے پھیلاؤ اور کشادگی کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ ؎

من می نگرم زبتدی تا اُستاد　　عجز ست بدست کہ از ما در زاد

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرۂ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دوائر سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہ مخواہ اس جزو کے کامل علم کے لیے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفے ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے، یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہے۔

تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبرا کر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کرینگے ایک ایجابیت اور دوسری اربیابیت

ایجابیّت

فرانس کے فلسفی اگست کامت (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت

میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تک پہنچا ہے، لیکن وہ فلسفے کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علتِ اولی، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقائق تک نہیں ہو سکتی وہ تجربے کے واقعات یا مظاہر اور ان کے توافقِ عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیاء کماہی کی حقیقت کیا ہے، یہ سب مابعد الطبیعیاتی تجریدات ہیں، ان سے احتراز ہی مفید ہے۔ فلسفے کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریق رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات کے گورکھ دھندوں میں اُلجھنا!

کامت کی ساری دلچسپی عمرانیات ہی سے تھی، وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے۔ لہذا کامت معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ فلسفۂ جدید قرار دیتا تھا۔ اس لیے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے، اور سائنس کا مقصدِ

وحید واقعات تجربیہ کے باہمی مستقل علائق اور ان کے قوانین دریافت کرنا ہے، اور یہ مشاہدہ اور تجربے ہی سے ممکن ہے۔ سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو متیقن و مفید اور قطعی ہوتی ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لیے مفید ہوتی ہیں، یہ علم ایجابی ہے۔ اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے۔

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کو کامت کے ساتھ اتفاق ہوگا نیز علوم معاشریہ کی اہمیت کے متعلق بھی کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا ہم اُس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفے کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور مابعد الطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائیگاں؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

ارتیابیّت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفے کی منزلِ مقصود کی طرف قدم اُٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیت کا ہے۔ خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں:۔

دورے کہ درو آمدن و رفتن ماست
او را نہ نہایت نہ بدایت پیداست
کس می نہ زند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیہ کے دور میں

ہوا "غورجیاس" کی تعلیم "سفسطہ" کا نمونہ ہے "کسی شے کا وجود نہیں، اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں، اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار وارتیاب کیا ہو سکتا ہے؟ چند دن بعد یونانی رومی دور میں ارتیابیت فلسفے کا ایک مستقل "اسکول" بن گئی جس کا بانی "پرہو" تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان مفکرین نے سقراط، افلاطون، ارسطو، دیمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا، اور گو اہل یونان نے اب تک مابعد الطبیعیات، اخلاقیات منطق ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں تاہم انہوں نے "پردۂ محمل" تک پہنچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعائی تھا، ذہن انسانی نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہٰذا یہ اکابرِ فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور اُن کا مذاق اُڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے، صداقتِ کلی ناقابل حصول۔ ہاں "انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے" "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رایوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہٰذا علم کلی کا امکان بالکل نہیں۔ فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے۔ اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ جب علم ہی کا امکان نہیں

تو صواب وخطا کا علم کہاں، کلی طور پر صواب وخطا کا وجود نہیں جو چیز تمہارے لیے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے بھی اچھی ہو۔ ضمیر شخصی معاملہ ہے۔ یہی حال جمال کا ہے۔ اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں۔ کیا تمہیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا جائے، بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچہ کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہاں پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادہ سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!"

زمانہ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے۔ ارتیابیت کا سب سے آخری حامی ادنبرا کا مشہورِ عالم مفکر ہیوم تھا (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت، بلکہ یہ حدودِ علم کی ایک ناقدانہ تحقیق و تدقیق تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدء تجربہ ہے، اس کی انتہا عالمِ مظاہر اور ایک قسم کی "لا ادریت" کہ علل انتہائی، روح، ایغو وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔

موجودہ زمانے کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ جدید مسئلہ کا امید و رجا کے ساتھ پیہم مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن

علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کر کے رہینگے کہ کونسا فلسفی صحیح ہے، حواس کا دھوکا کس طرح دور کیا جا سکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے۔ زمانۂ جدیدہ کی روح جرأت و جوش سے مملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اُٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں، لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا۔ مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیر قدم نہیں آئی ہیں، لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ ایک نہ ایک روز یہ زیر قدم آ رہینگی۔ یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلباء ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں۔ موجودہ فکر و تفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے، لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں سُلا رہا ہے، بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے :۔

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست　　نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست　　بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدود مٹی میں اس شعلۂ مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟ برٹرنڈ رسل اس رہا کن آزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت کرتا اور ہمیں راہِ عمل میں جری

بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "فلسفہ ان لوگوں کی مفتخرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش شک کے دائرہ میں قدمزن ہوتے ہیں، یہ مانوس اشیاء کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساسِ تحیر کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دیئے جا سکتے" لہذا ان کو اُٹھایا ہی نہ جائے۔ اور نہ اُن کے حل کی کوشش کی جائے۔ فلسفے کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ضرور ہے، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہونا اور اس کے حصول کی امید رکھنا۔ یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے!۔

ان دنوں ہم ارتیابیت کی بجائے لاادریت کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلے نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ تر وابستہ ہے، اس کے لفظی معنے ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری، یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہذا علم مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے۔ قانونِ اضافیت کے معنے یہ ہیں کہ کسی شئے کا علم دوسری خارجی اشیاء کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتی ہیں۔ نیز یہ شئے ذہن کی ضمانت

و تعلق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہو گا، لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرۂ علم سے ماورائے غیر معلوم و ناقابلِ علم ہو گا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ماوراء نہیں پہنچ سکتا اور یہ سب کے سب ایک "ناقابلِ علم ہستی مطلق" کے شئون و احوال ہیں۔

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذاتِ مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے۔ یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہو گی، ظہور خود حدِ اضافی ہی جو کسی ہستی کے وجود کو مستلزم ہے۔ اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے محض وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شئے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کر دیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان ذاتِ مطلق کے ظہور ہیں لہٰذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعے قابلِ علم ہے، اس میں شک نہیں کہ ذاتِ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہم اس کو ایک حد تک ضرور جزئی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کی کچھ صفات

سے واقف ہو سکتے ہیں، لہذا لا ادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفے کو تلاش ہے وہ ناقابلِ حصول ہے۔ شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے، لہذا یہ سائنس اور فلسفہ ہر دو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو ان تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے۔ فلسفی یا "عاشقِ حکمت" "آزار جستجو" ہی کو اپنی غایت سمجھتا ہے اور اقبالؒ کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیافریدی آزار جستجو را

اور "در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را" کہتا ہوا "رمز کائنات" کا ہمیشہ جویا و متلاشی رہتا ہے!

فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت

سچ تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کر دیا تھا کہ آیا ہم فلسفے کا مطالعہ کریں یا نہ کریں۔ اس نے کہا تھا کہ "ہم فلسفیانہ غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ چاہیں ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے"۔ شوپنہور نے انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لیے کہا تھا کہ انسان "مابعد الطبیعیاتی حیوان ہے"۔ اڈون والس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر فرد کائنات

کے رشتۂ باہمی کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کر لیتا ہے
اور اسی پر اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی خیال
کو پاولسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہی، عہد فطرت
میں بسنے والے وحشی کا بھی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و
کردار کا مرکز ہوتا ہے! اور اسی معنی کے لحاظ سے جسٹرٹن کہتا ہے کہ
"آدمی میں سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ
نظر ہے" — یعنی اس کا فلسفہ!

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیت و غایت
کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کو چند ایسے
مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ
و اختیار سے نہیں ہو سکتی۔ حواس جن چیزوں کی شہادت دیتے
ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں
کہ وہ اپنی مرضی یا ارادے ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہ
مخواہ اس کو کرنا ہی پڑتا ہے، وہ کامت کی طرح اپنے کو "ایجابی" کہہ
سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد
تک محدود رہنا چاہتا ہے، یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہو کہ وہ
"لا ادری" ہے اور اشیا کما ہی کے علم سے ناواقف، لیکن وہ ان احتجاجات
کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہ مخواہ فلسفی ضرور
ہے۔ وان ھذا لشئی عجاب! بڑے سے بڑا لا ادری، بڑے سے بڑا

شکی یا اریتابی اپنے عقائد و افکار مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے۔ باوجود ایجابیت و لاادریت کی لن ترانیوں کے باوجود ماورائی شان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت ناقابلِ علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اس نے ان خوفناک استعدادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غایت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ، یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہیے، خواہ یہ خدا کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ ایک خودرو مشین یا کل ہے جو دوسری مشین سے ہم صحبت ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوت حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا نورِ الٰہی کی گریز پا شعاع! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بداہت حقیقت کی رہنما اور صداقت کا معیار ہے۔ اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہیگا یا اپنی قوت مردانگی کو قیمۃً تقسیم کریگا! اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے

کہ آیا مرنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے "خاکی است بخاکش ہمی دہند" یا "چو دانہ خاک شگافد گل تراست" ایک اعلیٰ وارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے!

یہ تمام نہایت اہم مسائل ہیں، اور فلسفہ موت و حیات کا مدعا ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفے کا کٹر سے کٹر مخالف بھی اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر چکا ہوتا ہے، مثلاً وہ فرض کر لیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں۔ شجر و حجر، لطف و کرم، دعا و عبادت ــ سب مادی ہیں، ان کی مادی پیمائش ہو سکتی ہے۔ یہ ایک شاندار مفروضہ ہے، جس کی اختیاری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابل تعریف سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکانیت ہے اور وہ خود ایک مشین ہے جو میکانکی اور غیر شعوری طور پر شعور کے زاید از ضرورت اور فضول ارتقا پر غور کر رہا ہے، دنیا کی ماہیت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جو اب تک ناقابل ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس یا لکریٹس یا ہابس یا لامتری پیش کرتے ہیں تو فلسفے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں ہستی کا ہر فعل اس ابتدائی ضبابہ (Nebula) نے متعین و مقرر کر دیا ہے جو سائنس کی ضمنیات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری

سامعہ نوازی کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول و باستناد نیٹشے نعوذ باللہ خدا ایک عرصہ ہوا کہ مر چکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منادر میں بنائی جا چکیں!

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں۔ ہر فلسفی ان کو یا ان کے مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ہم سب کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں مطلق کا "آزارِ جستجو" ہمارا "آرام جاں" ہوتا ہے، اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے؟ وہ دیارِ نامعلوم کا سفر ہے، لامحدود کی تلاش میں کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ سرگرداں ہونا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دل فریبی ہے اس سے زیادہ نہیں!

لہذا ہم سب فلسفی ہیں، مابعد الطبیعاتی حیوان ہیں، ایک جو اعلانا فلسفی ہے، دوسرا جو اقرار گاہ ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے۔

فلسفے کی ترقی پر اعتراض

فلسفے پر ایک اعتراض عام طور سے کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں، اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے، تاریخ فلسفہ ان ہی تناقضات و نظری آراء کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔

حقیقت میں فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعے کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازے کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بیشک اسی دروازے سے نکل آئینگے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابر فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزارہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم خود فلاسفہ کے تناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونگے اور پائینگے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابر فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے زمانے کے اصطلاحات و حدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائیگا کہ فلسفہ سے

زیادہ سائنس میں نظریات و اعتقادات سینما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزارہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کرینگے:۔

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کی ابتدا کی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ ضبابیہ (Nebular hypothesis) سے کی جاتی تھی۔ کانٹ فلسفی نے اس نظریے کو سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور مولٹن نے اس کی توجیہ میں Planetesimal hypothesis پیش کی ہے جو اول الذکر نظریے کی تردید کرتی ہے۔ پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی اصل انواع یا origen of Specis، ارتقاء کی انجیل سمجھی جاتی تھی۔ آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقاء کی توجیہ تغیرات (Variations) کے بجائے "تحولات" (Mutations) سے ہونے لگی، اب مسٹر گیامرہ کے ساتھ ہم لامارک کے نظریے کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ببیں تفاوتِ راہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین بتائے، دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا۔ اب آئنسٹائین (Einstein) ان کی تردید کر رہا ہے۔ مے یررم فورڈ، ڈے دی ار

صدہا دیگر علمائے سائنس نے مادّے کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور سادکمی، ردر فورڈ، پینگاکے جدید سائنس کے ان انتہائی عقائد میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیان ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر و ابدی قوانین مادے کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفے کی طرح غیر یقینی ہو گئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی وقعت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو تیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلاثہ صاحب اولاد ہو گئے، جزء کل کی برابر بڑا ہو گیا اور آئنسٹائین (Einstein) نے ثابت کر دیا کہ دو نقطوں کے درمیان ایک خط مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا، مسٹر وگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے۔ اب ڈاکٹر واٹس دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچے کا ماحول اس کی سیرت اور تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آئے

دن ہر ایماندار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ جھوٹ کا دریا ہے۔[1]
ہر ایمان دار عالم مصریات (Egyptologist) سنین و سلسلہ ملوک
کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند
ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!

سائنس کے نظریات کے عدیم التغیر ہونے کے ثبوت میں
یہ مثالیں اہل بصیرت کے لیے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے
کی ضرورت نہیں! فلسفی کی نظروں کے لیے تو یہ خوش کن سحر ہے!
فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہمیں اعتراف ہے کہ فلسفہ بعض
جگہ تاریک ہے، لیکن یہی حال شلی کی نظم کا ہے، یہی حال جنس
لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شئے کا ہے! اس سے بدتر
ہم یہ بھی ماننے کو تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے۔ ہم اپنے
قلب کے عزیز تعصبات کو، بڈھی عورتوں کی دینیات کو قطعی و
یقینی دلائل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ اسی بناء پر ایک
مشہور فلسفی براڈلے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف
کی ہے کہ "مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لیے جن میں
ہم جبلی طور پر یقین کرتے ہیں خراب حجتوں کا دریافت کرنا ہے۔
لیکن ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جبلی نہیں" لیکن باوجود
ان تمام نقائص و خرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفے کی رفتارِ ترقی

---

[1] Missisipi of Folsehoods (Voltaioe)

بھی متعین اور شاندار ہے، گزشتہ پچیس سال میں فلسفے نے اسی سرعت وشان کے ساتھ ترقی کی ہے جس طرح کہ سائنس نے ولیم جمیس جیسے محتاط وسائنٹفک فلسفی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

"بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو "سائنس" نے فلسفے سے کم ترقی کی ہے۔ یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ ارسطو کو حیرت ہوگی اور نہ ڈیکارٹ کو اگر بفرض محال انہوں نے زمین کی سیر کا پھر ارادہ کیا۔ اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا، ان کا ارتقاء، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انہیں معلوم و معتاد چیزیں نظر آئینگی۔ ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً بجلی کی روشنی، ٹیلیفون اور سائنس کے دیگر جزئیات ان کو ضرور مرعوب کرینگی۔ لیکن اگر یہ ہماری مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفے کے لکچر روم میں آئیں تو ہر چیز انہیں اجنبی سی معلوم ہوگی۔ ہمارے زمانے کا سارا "تصوری" یا "انتقادی" پہلو انہیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں انہیں دیر لگیگی۔"

یہ ہے فلسفی کا جواب فلسفہ کے معترضین کی خدمت میں!

عرفی گلہ سر مکن کہ جائے گلہ نیست
توفیق رفیق ہر تنگ حوصلہ نیست
ہر چاہ کہ ہست یوسفے در وے ہست
صاحب نظرے لیک بہر قافلہ نیست

ہم فلسفہ کیوں پڑھیں

آخر یابد ہر کہ زصد قش جوید — تخمے کہ بجا فتاد آخر روید
گویند کہ ہر کہ یافت حرفی نزند — نے نے غلط ست ہر کہ یابد گوید
(شاہ بدخشی)

ہیگل کا قول ہے کہ "جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادتگاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ ہے لیکن جس میں 'قدس الاقداس' ہی کا وجود نہیں"۔ جس طرح ہر متمدن قوم کا ادب و فن ہوتا ہے، معاشری و مذہبی زندگی ہوتی ہے، اسی طرح اس کا فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ مشرق میں مُتشرّعوں اور مغرب میں فلاطون کے زمانے سے فلاسفہ کا یہ کام رہا ہے کہ نصب العینوں کی تشکیل کریں اور یہ بتلائیں کہ حیاتِ انسانی کے کن تجربات کو اہم یا مرکزی قرار دیا جائے اور اس طرح قوم کی رہبری کریں۔ فلسفہ زندگیوں کو بدلتا رہا ہے، اسی معنی میں یہ تخلیقی ہے۔ تہذیب عملی فلسفہ ہے"۔

("A Civilization is Philosophy Concretized")

کن افادات کی بنا پر فلسفہ کو یہ رتبہ حاصل رہا ہے! ان ہی کی

مختصر تشریح اس وقت گوش گزار کی جارہی ہے۔ ؎

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نکنی!

(۱) فلسفہ عملی ہے:۔

اول قدم پہ عام یقین کے خلاف ہم یہ بتلائینگے کہ "فلسفہ عملی ہے"۔ نُوا لِس نے کہا تھا کہ فلسفہ کا کام روٹی پکانا نہیں؛ لیکن وہ ہمیں خدا، آزادی اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے" فلسفہ آپ سے مخاطب کرتا ہے:۔

یک دم غم جاں بخور غم ناں تا کے
در پرورش ایں تن ناداں تا کے
اندر رہ طبل شکم و نائے گلو
ایں رقص زنخ بضرب دندان تا کے (رومی)

تن ناداں کی پرورش میں ہمہ تن مصروف ہو کر آپ اس سے انکار کیجیے۔ شک کے جنون میں خندہ زناں پوچھیے کہ کیا واقعی فلسفہ خدا آزادی و حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے؟ بس بس ؎ در خود نگر و فضولی آغاز مکن۔ کیا فخر رازی نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ ؎

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم ہم شد کہ ہیچ معلوم نشد

ہاں فلسفہ ہمیں ان چیزوں کا یقین عطا نہیں کرتا، جو چیزیں ہمیں آسانی سے ملتی ہیں ہم اُن کی قدر بھی تو نہیں کرتے! فلسفہ کا کام

روٹی پکانا نہیں۔ لیکن یہ روٹی پکانے والے کی زندگی میں نئے معنی ضرور پیدا کرتا ہے اور خود روٹی پکانے کو اہمیت بخشتا ہے کوتاہ و تنگ نظر افادی مقاصد، مادّی منافع، فلسفہ کے محرک ہیں اور نہ کبھی رہے ہیں۔ تاہم گلبرٹ، چسٹرٹن کے اس قول میں ایک صداقت پنہاں ہے کہ ایک لانڈلیڈی کے لیے جو کسی کرایہ دار کو اپنے مکان میں بسانا چاہتی ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کرایہ دار کی آمدنی کیا ہے، لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ جاننا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات کیا ہے؟"

اگر انسان کی زندگی کے لیے صرف روٹی ہی ضروری اور کافی ہے، اگر 'رقص زنخ و ضرب دنداں' ہی کو وہ مشغلۂ حیات سمجھتا ہے تو پھر وہ صاف طور پر بغیر شرم و حیا کے کیوں نہیں پوچھتا کہ شاعری و موسیقی اور رنگارنگ کے پھولوں کا کیا عملی فائدہ ہے؟ ان سے وہ کیوں محظوظ ہوتا ہے؟ موجودہ تمدن کی تن آسانیوں کے باوجود انسان کا ذہن حیرت و محبت سے مبتہج ہوتا ہے اور صداقت، جمال اور خیر کا شیفتہ و فریفتہ ہے۔ اور یہی فلسفہ کے اقدار ہیں، لیکن ذرا اس امر کی تحقیق تو کیجیے کہ ہم کسی چیز کو عملی کیوں کہتے ہیں اور کب کہتے ہیں؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ عملی کہلاتی ہے؟ بلاشبہ ہم عملی کے معنی کو صرف روپیہ کمانے کی قابلیت ہی کی حد تک محدود نہیں کر سکتے، گو ہمارا

یہ یقین ہے کہ فلسفہ اس قابلیت میں کسی قسم کا نقص نہیں پیدا کرتا بلکہ انسان کو ایک مرفہ الحال جماعت کا رکن بنانے میں مدد کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ کی حقیقی عملیت کے ایک اور معنی ہیں۔ فلسفہ عملی ہے اس لیے کہ وہ

(۱) تمام مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے۔

(۲) تمام اشیاء، واقعات، تجربات اور اشخاص کو ان کے تمام علائق و اعتبارات میں رکھ کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

(۳) ہمارے مقاصد و غایات، ہماری تعلیم، صنعت و حرفت حکومت و مملکت، اخلاق و آداب و مذہب پر کامل و متوافق طور پر غور و فکر کرنے پر ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔

(۴) حیات انسانی کے معنی اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق ایک عزت بخش نظری تصور قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو جماعت یا معاشرہ میں ایک پاک و صاف و کارآمد زندگی بسر کرنی چاہیے۔ شہری ہونے کی حیثیت سے وہ محض روپیہ کمانے کی مشین نہیں بلکہ وہ ایک شوہر بھی ہے اور باپ بھی، وہ ایک ہمسایہ ہے جو نظم و قانون، صحت عامہ، مکانات کے حسن و آسائش اور نئی پود کی صحتِ اخلاقی سے گہری عملی دلچسپی رکھتا ہے۔ ان چیزوں سے عقلی دلچسپی

رکھنا زندگی پر من حیث کُل نظر ڈالنا ہے، اور یہی فلسفہ ہے۔ سقراط نے ہمیں تنبیہ کی تھی کہ جس زندگی کا نظرِ غائر سے امتحان نہ کیا گیا ہو وہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں" اب انسان ہونے کے معنی عملی ہونے کے ہیں اور عملی ہونے کے معنی زندگی کی غایات و اقدار اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور و فکر کرنے کے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور فلسفی شلر کہتا ہے کہ یہ نہایت جرأت کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تہیج فکری اپنی ہدایت و ماہیت کے لحاظ سے بالکلیہ عملی ہے۔ فلسفہ کے انتہائی مسائل وہی ہیں جو زندگی کے عملی مسائل کے نتائج تک پہنچنے سے حاصل ہوتے ہیں، ان کا تعلق اس نظریہ سے ہے جس کی توثیق ہر عمل کو کرنی چاہیے۔"

(۲) فلسفے کے مختلف شعبے خود مفید ہیں:۔

فلسفے کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالو تو تمہیں خود ان مسائل و اغراض کے مفید ہونے کا یقین ہو جائیگا۔

مثلاً منطق استدلال کے اصول سے بحث کرتی ہے۔ وہ صحیح استنباط کے شرائط کا مطالعہ کرتی ہے۔ کیا ہم سب تفکر و استدلال کے معاملہ میں غیر محتاط و متناقص واقع نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ہمیں کسی دائرہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے یا کسی معاملہ میں عملی طور پر کامیاب ہونے کے لیے تفکر و استدلال میں متوافق

ہونے کی ضرورت نہیں ؟ ان مسائل سے کوئی دوسرا مضمون بحث نہیں کرتا۔

اخلاقیات حیات اخلاقی کے اصول و معیارات سے بحث کرتی ہے۔ "مفتاح خزائن سعادت دنیوی" پیش کرتی ہے، راہِ عمل سمجھاتی ہے، نیکی کی طرف لے جاتی، آدمیت کو "لحم و شحم و پوست" پر مشتمل نہیں قرار دیتی بلکہ "رضائے دوست" اصل انسانیت قرار دیتی ہے۔ دیکھو اس رباعی میں اخلاق کے کیا گر بیان ہوئے ہیں :-

با نفس جہاد کن شجاعت این است
بر خویش امیر شو امارت این است
انگشت بہ حرفِ عیبِ مردم مگذار
مفتاحِ خزائنِ سعادت این است

کیا یہ انسان کو حقیقی معنی میں عملی اور کامیاب بنانے کے لیے کافی نہیں اور کیا ان کی ہر فرد بشر کو ضرورت نہیں؟

فلسفۂ معاشرۂ حیات انسانی کے ان غایات و اقدار سے بحث کرتا ہے جن کا تحقق حیات معاشری و ادارات مدنیہ میں ہوتا ہے جس کے علم کے بغیر زندگی حقیقی معنی میں کامل نہیں ہوتی۔

علمیات یا نظریۂ علم فکر کے شعوری و غیر شعوری مفروضات کا امتحان کرتا ہے، مذہبی اخلاقی، سیاسی، معاشیاتی و تعلیمی ادبیات

پر خامہ فرسائی کرنے والے اور نیز علمائے سائنس نہ اتنی فرصت رکھتے ہیں اور نہ انہیں اس قدر دلچسپی ہوتی ہے کہ ان تجریدی معاملات کا امتحان کریں۔ خصوصاً شاعری ایسے تصورات سے مملو ہوتی ہے جس کے تضمنات و مدلولات کا امتحان ضروری ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کائنات و زندگی کا ایک جامع نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اور فلسفہ کے دوسرے شعبے ان سوالات کی تحقیق کرتے ہیں جن کے اُٹھانے پر عقلِ انسانی مجبول و مجبور ہے۔ تہذیب کی ساری تاریخ میں قدیم اہلِ یونان سے لے کر ہمارے زمانہ تک، انسان نے ان مسائل کی تحقیق میں بے اندازہ سرور حاصل کیا ہے اور اس تحقیق سے جو بصیرت حاصل ہوئی ہے وہ اس کی آرام جان ثابت ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے، فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دلفریبی ہے اس سے زیادہ نہیں!

(۳) فلسفہ علم کو جامعیت بخشتا ہے۔

فلسفہ علم میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ حیات فکری میں وحدت پائی جاتی ہے، لہذا علم میں بھی وحدت ضروری ہے۔ عقل نظریات میں توافق و جامعیت کی متلاشی ہوتی ہے اسی کی تشفی کرتے

ہوئے فلسفۂ زندگی کے تمام مخصوص اغراض میں رشتۂ وحدت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس Scinces (علوم) انسان و عالم کے متعلق۔ واقعات نظریات و قوانین کا توضیحی و علمی بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ محض طریقے اور راستے بتلاتے ہیں، فلسفہ ان کے برخلاف ترکیبی و توجیہی واقع ہوا ہے، یہ زندگی کے وسیع تر غایات و مقاصد و اقدار سے بحث کرتا ہے، یہ ہمیں اقدار کی دنیا میں لیجاتا ہے، جب غایات و اقدار پر غور و فکر کرلی جاتی ہے، عام اصول کا استحکام ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر عملی قدم پر رہبری و ہدایت کا چراغ ضیا پاشی کے لیے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔

(۴) فلسفہ ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ کس چیز کے متعلق سوال کریں اور سوال کس طرح کریں۔

بعض دفعہ فلسفہ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ نہ کسی مسئلہ کو حل کرتا ہے اور نہ کسی سوال کا قطعیت کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ سائنس کے برخلاف جو ضروری اور اہم سوالات کے مخصوص جواب دیا کرتی ہے، فلسفہ محض سوالات کو اٹھاتا ہے اور جواب کسی کا نہیں دیتا ہے

آں قوم کہ راہ بیں فتادند شدند
کس را بہ یقیں خبر ندادند شدند
آں عقدہ کہ ہیچ کس نہ انست کشاد
ہر یک بندے برآں نہادند شدند

(طوسی)

ذرا توقف کیجیے اور ایک وقت میں ایک سوال کیجیے۔ کیا آپ کسی ایسی سائنس کا نام بتا سکتے ہیں جس نے کسی بھی اہم سوال کا یقینی و قطعی جواب دیا ہو؟ سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سائنس میں نظریات و اعتقادات سنیما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزارہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔[1]

اسی خوش کن سرکس کو نظروں کے سامنے رکھ کر نورڈشو نے کہا ہے کہ "دنیا میں کوئی شئے اتنی سریع الزوال یا گریزپا نہیں جتنی کہ سائنٹفک تھیوری (حکیمانہ نظریہ) اور نہ ہی کوئی شئے، اتنی فرسودہ، پھپھوند بھری، متعفن اور سڑی جتنی کہ پرانی سائنٹفک تھیوری۔ علماء سائنس فلسفیوں پر یہ کہہ کر طعن کرتے ہیں کہ اس پیشے کے لوگ ایک دوسرے کی تردید کرکے جیتے ہیں، لیکن در حقیقت یہ طعن علماء سائنس پر بھی اتنا ہی صحیح ہے۔" اسی لیے ان دنوں پختہ کار، بالغ نظر علماء سائنس اپنے بیان میں نہایت محتاط اور متواضع واقع ہوئے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ علوم ایجابیہ (Sciences) بھی زیادہ سوالات اٹھاتے ہیں اور بہت کم جواب دیتے ہیں۔ علوم ایجابیہ واقعات کو جمع کرتے ہیں اور ان پر قوانین و نظریات کو مرتب کرتے ہیں اور ان ہی اعلیٰ تعمیمات کے متعلق

---

[1] دیکھو اوپر ص۲۲، و ص۲۳

علمار سائنس ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ صورتِ حال وہی ہے جس کی توقع کی جانی چاہیے، چونکہ انسان کو تمام واقعات کا علم نہیں لہذا مسائل کے حل میں مختلف علمار مختلف مفروضات و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اختلاف آرار لازمی نتیجہ ہے۔ اسی معنی میں فخر رازی کے ان اشعار کو لیجیے جن میں سے ایک شعر کا اوپر بیان ہوا۔

ہرگز دل من ز علم محروم نشد　　کم ماند اسرار کہ مفہوم نشد!
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز　　معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد!

سائنس و فلسفہ دونوں کی تاریخ انسان کے علم کے ناقص و ناکامل ہونے کو بتلا رہی ہے۔ حقیقت انتہائی کے علم کے متعلق ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ

نہ عقل بہ سر حدِ کمال تو رسد　　نہ جاں بہ سراچۂ وصال تو رسد
گر جملۂ ذراتِ جہاں دیدہ شود　　ممکن نبود کہ در جمالِ تو رسد

(عطار)

لیکن سائنس اور فلسفہ کے متخالف و متضاد مسلک ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ فلسفہ بھی سائنس کی طرح انسان کے علم کی کمیت و کیفیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ انسان کی فہم کو جلا بخش رہا ہے، روشن کر رہا ہے، اور دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے رہا ہے۔

فلسفہ کی ناکامیوں کو ماننے کے باوجود جو سائنس کی ناکامیوں کی طرح قابل شرم ہیں !) ہم کہتے ہیں کہ فلسفہ اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرتا ہے اور اپنے طالبِ علم کو دیدۂ بینا عطا کرتا ہے اگر وہ صرف یہ سکھلاتا ہے کہ عقلی طور پر کونسے سوالات کیے جا سکتے ہیں اور کونسے سوالات نہیں کیے جا سکتے۔ بقول پروفیسر کالنگس کے "اگر فلسفہ استنطاق کے سوا کچھ نہیں تو یہ کم از کم ہمارے سوالات کو مُشکل کرتا ہے؛ ان کو ایک دوسرے سے متوافق بناتا ہے، بلفظ واحد ہم کو عقلی سوالات پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جاننا اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی جاننا کہ ہم جانتے کیوں نہیں ایک قسم کا فائدہ ہے۔" برٹرنڈ رسل کے اس قول میں صداقت بھری ہے کہ "در اصل فلسفہ کا فائدہ زیادہ تر اس کی حیرت و عدم یقین ہی پر مشتمل ہے۔ جس شخص کے خمیر میں فلسفہ کی آمیزش نہیں اس کی زندگی ایسے زندان میں بسر ہوتی ہے جس کی کچھ تیلیاں تو فہم عام کے تعصبات نے گھڑی ہیں، کچھ اس کے زمانہ اور قوم کے اعتیادی تیقنات نے، اور کچھ ان اذعانات نے جو اس کے ذہن میں بغیر عقل و فہم کے اشتراک و رضامندی کے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا محدود و متعین و واضح ہو جاتی ہے؛ عام اشیاء اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں کرتیں اور غیر مانوس امکانات کو وہ حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے" بقول براؤننگ کے اس قسم

کے لوگ ان حیوانات کے مانند ہوتے ہیں جن کی محدود مٹی میں شک کی مستنیر شعاعیں اپنی تابناکیاں نہیں دکھلاتیں۔" فلسفہ مانوس اشیاء کو نامانوس لباس میں پیش کر کے ہمارے احساس تحیر کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے"، فلسفہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ وہ ہمارے مفروضات و ظنیات سابقہ سے ہمیں واقف کرتا ہے اور ان پر شک کرنا سکھلاتا ہے۔ اسی معنی میں کانٹ نے کہا تھا "There is no philosophy there is only philosophising" "فلسفہ نہیں تفلسف اصل شے ہے!" ہمیں علم کی خواہش ہے، کامل و مکمل صداقت کے ہم جویاں ہیں۔ لیکن سوچو تو "سعی" میں بھی اتنی ہی لذت ہے جتنی 'حصول' میں! غالب کے دل سے اس لذت کو پوچھو جو اس کی "سعی لاحاصل" میں تھی! بو علی سینا کی طرح ہم بھی کہینگے:۔

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار بشتافت
یک موئے نہ دانست ولے موئے شگافت

اندر دل من ہزار خورشید بتافت
وآخر بکمالِ ذرۂ راہ نیافت

فلسفہ گو "کمالِ ذرہ" تک پہنچ نہ سکا (اور سائنس کب ذرہ کی ماہیت سے واقف ہے) لیکن دل تو تفلسف و تفکر کی وجہ سے ہزار خورشید تاباں کی طرح چمک اٹھا!

(۵) فلسفہ فرد کو کائنات میں اپنی جگہ پہچاننے میں مدد دیتا ہے:-

فرد کا فطرت میں کیا مقام ہے؟ میں کون ہوں؟ سرگشتہ بہ عالم زیرے چیستم؟ انسان حیوانات سے بھی وابستہ ہے اور اپنی عقل و فکر کی وجہ سے ان سے ممیز بھی۔ کیا ہی تعجب کی بات ہے کہ وہ دوسرے حیوانات کی طرح قوانین جبر کے ماتحت بھی ہے اور صداقت، حسن و خیر کا جویا و متلاشی بھی۔ سوائے فلسفہ کے ان عمیق مسائل پر کوئی علم روشنی نہیں ڈالتا۔

طبیعی علوم دوربین اور خوردبین کی مدد سے مکان کے حدود کو پیچھے ہٹاتے جا رہے ہیں اور نئے عوالم کا انکشاف کر رہے ہیں۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارا یہ سیارہ (زمین) جس پر ہماری بود و باش ہے اپنے آفتاب سمیت جو ایک قریب الموت ستارہ ہے، کروڑہا ستاروں، آفتابوں، اور سیاروں میں ایک ناچیز ذرۂ خاک ہے، تو انسان کے قد و قامت کے ڈیڑھ دو گز کتنے حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی مخلوق قوت فکر رکھتی ہے احساس و تخیل کی قابلیت رکھتی ہے اور ان کی مدد سے اجرام سماوی کی عظیم الشان ترتیب پر غور کرتی ہے اور زمین کے نباتی و حیوانی عجائب پر سر دھنتی ہے تو پھر انسان کی عظمت و وقعت مبرہن ہو جاتی ہے چنانچہ پیاسکل نے کہا تھا "انسان محض ایک نئے کے مانند ہے

فطرت کی کمزور ترین نے، لیکن وہ فکر کرنے والی، سوچ بچار کرنے والی نے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساری کائنات اس کو کچلنے کے لیے ہتھیار بند ہو جائے، ہوا کا ایک جھونکا، پانی کا ایک قطرہ اس کے مارنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر کائنات انسان کو کچل بھی ڈالے تب بھی انسان اپنے مارنے والے سے زیادہ شریف ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مر رہا ہے اور کائنات کو اس برتری کا کوئی علم نہیں جو اس کو انسان پر حاصل ہے"۔ اس طرح کائنات میں اپنی حیثیت و منزلت سے واقف ہونا نفس کو قوی بناتا ہے، انسان کی زندگی کو گراں قدر و باوقعت قرار دیتا ہے۔ مشاہدہ و قوتِ فکر کی وجہ سے انسان گو جزئی طریقہ ہی سے سہی یہ سمجھتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات ایک نظام رکھتی ہے، قانون و ہم آہنگی اس پر حکومت ہے اور انسان اس کا ذی علم ناظر ہے!

علاوہ ازیں فلسفہ انسان کو اس پیچیدہ و مرکب نظام معاشرت میں اپنی جگہ کے پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ خود معاشرت کی ترکیب کئی متداخل اداروں سے ہوئی ہے جن میں ہم خاندان حکومت، مذہبی محکموں، اور صناعی اداروں کا ذکر کر سکتے ہیں فرد کو موجودہ زمانہ کی اس پیچیدہ معاشرت میں حصہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام معاشرت من حیث الکل کا ایک صاف

واضح اور اُجاگر تصور ذہن میں رکھے او متقابلہ معاشری اقدار سے واقف ہو۔ فلسفۂ معاشرت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ فرد کو ایک اچھے شہری بننے کے قابل بناتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم تحقق ذات کو بلند ترین اخلاقی غایت قرار دیں جو دوسرے نفوس کے باہمی اشتراک کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس غایت کے حصول کے لیے دنیا اور زندگی کا ایک جامع اور مستوعب علم ضرور قرار پاتا ہے۔ انسان کی برترین مسرت اور اس کی ترقی وتکمیل ان اشیاء، واقعات و اعمال کے جاننے اور ان کی قدر کرنے پر منحصر ہوتی ہے جن کے درمیان اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس کی ذات، فکر، احساس و عمل اس کے وجود کی ساری قدر و اہمیت، اپنا سارا مواد یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کی اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی فطرت کا کمال و تحقق خارجی دنیا ہی کی مخالطت و مصاحبت سے ممکن ہے۔ انسان جس قدر زیادہ اپنی ذات سے واقف ہوتا جا رہا ہے، اسی قدر زیادہ اس کو صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی ذات کا تحقق فطرت و معاشرت کے ساتھ ارتباط و انصال ہی سے ممکن ہے، انسان کی زندگی خلاء میں نشو و نما نہیں پا سکتی۔ فلسفہ نہ صرف تحقق ذات کے معنی کی توضیح و تعریف کرتا ہے بلکہ اس کے حصول کے طریقے بھی بتلاتا ہے۔

فلسفہ اپنے طالب علم کا تعارف بنی نوعِ انسان کے عظیم الشان مفکرین اور ذہنی قائدین سے کراتا ہے۔ اِن تخلیقی ذہنوں کی صحبت سے زیادہ شخصیت انسانی کو مالا مال بنانے میں کوئی شئے مؤثر نہیں۔ فلاطون نے کہا تھا کہ "دنیا میں چند ایسے ملہم وجود ہیں جن کی صحبت بے بہا ہے" مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی
یا در رہِ دیں صاحب دردے گردی
ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب
مردے گردی چو گردِ مردے گردی

فلسفہ انسان کو اس مجلس میں پہنچاتا ہے جہاں سقراط و افلاطون، ارسطو و ایپکیورس، فلاطینوس و سینٹ اگسٹائن، ٹامس اکوئناس، ابن سینا، غزالی، ابن رشد، ڈیکارٹ، اسپنوزا بارکلے، ہیوم، کانٹ و ہیگل، اسپنسر و ولیم جیمس، شلی و کیٹس اور گوئٹے، باخ اور واگنر خنداں پیشانی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں، اور ہم جب تک سننے پر راضی ہوں ہم سے گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔ خدائے لایزال کے اس شہر میں جہاں یہ مجلس آراستہ ہے لامتناہی خزائن ہمارے سامنے رکھے ہوئے ہیں ہمیں صرف آگے بڑھ کر ان سے مالا مال ہونا ہے!

(۶) فلسفہ ہمیں جمالیاتی لذت بخشتا ہے:۔

فلسفہ ایک نہایت اہم معنی میں اپنی غایت آپ ہے ۔لذتِ جمال کی طرح فلسفیانہ غور و فکر اپنی آپ منزل ہے ۔فلسفہ کی نظری قیمت کے لیے حجت و استدلال پیش کرنا ایسا ہی ہو جیسے یہ ثابت کرنا کہ انسان کو حصولِ صحت کی کوشش کرنی چاہیے، دوستی و محبت قائم کرنی چاہیے، سیرت اخلاقی کی تکمیل کرنی چاہیے، شعر پڑھنا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہیے ۔ جو لوگ ان تجربات و اقدار سے واقف نہ ہوں وہ حجت سے قائل نہیں ہو سکتے ۔ان کی اصلی قیمت شخصی و باطنی ہوتی ہے، ان کی قدر و قیمت کا احساس دوسروں میں پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔افلاطون کسی جگہ خیر و صواب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ "جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہیں" ان کی ہستی زیادہ حقیقی ہوتی ہے؟ ارسطو شہرت اور دنیوی معاملات میں حصہ لے کر ذات کی تکمیل و تحقیق کے جذبہ کو سراہتا ہے لیکن ایک صحیح معنی میں تعلیم یافتہ شخص کی فکری زندگی کو حیات کی اعلیٰ ترین غایت قرار دیتا ہے ۔ اسپنوزا کو "خدا کی عقلی محبت" میں اور صوفی کو صداقت، خیر و جمال کی وحدت کی بصیرت سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہے؟ برٹرنڈ رسل جب دنیا کے معاشرت کے اختلال و اضطراب، شر و فساد سے ہٹ کر ریاضیات و منطق کے

دائمی حقائق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو جو سکون، راحت وطمانیت حاصل ہوتی ہے وہ صوفی کے غایتِ سرور و فرطِ حظ سے زیادہ مختلف نہیں۔

(۷) فلسفہ ہماری سیرت و شخصیت کو قوی کرتا ہے:۔

فلسفہ ہمیں وحدت ذہنی عطا کرتا ہے۔ آپ ہم سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقض ہوتے ہیں، ہمیں بڑی حد تک توافق و تطابق کی ضرورت ہے۔ فلسفیانہ تعلیم ہمیں فکری وحدت بخشتی ہے، اس وحدت ذہن یا وحدت فکر سے ہماری خواہشوں میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم میں سے سب کی غایت مقصوی ہے۔ خوش باشوں کے شہنشاہ اپیکیورس نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس میں وہ کہتا ہے:۔

"کسی شخص کو جب تک وہ جوان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے میں دیری نہ کرنی چاہیے اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہیے، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کے علم کو حاصل کرنے میں وقت کی موزونیت

دنا موز و نیت اور نا خیر کا خیال کریگا؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ فلسفہ سیکھنے کا ابھی وقت نہیں آیا یا وہ وقت گزر چکا تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا"[۱]

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنے جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے دوسروں کی غلامی سے نجات پاتا ہے، اپنی ذات کے شریف تر جوہر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

در بستر آرزو غنودن تا کے | تا کے مرہونِ نفس بودن تا کے
یکبار بسہو ہم سرے بالا کن | بر درگہ خلق جبہ سودن تا کے

(منصور دامغانی)

روما کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں:-

"اے فلسفہ کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا!" (سسرو)

---

[۱] دیکھو ایم، پیکیول کی کتاب Source Book in Ancient Philosophy صفحہ ۲۶۹ (چارلس اسکربنرس سنس ۱۹۰۷ء)

فلسفہ کی دشواریاں

اسرارِ وجود خام و آشفتہ بماند
واں گوہرِ بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس زسرِ قیاس حرفے گفتند
واں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند (بو علی سینا)

فلسفہ اپنے بیشمار فوائد اور خوبیوں کے باوجود مشکل ضرور ہے، باوجود اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے فلسفہ کا مطالعہ آسان نہیں۔ مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی میں کوئی قیمتی شے بے کاوشِ جان نہیں ملتی، "بے خون پیے لقمۂ تر کسی کو نہیں ملتا" اور "بے خاک چھانے زر کسی کو نہیں حاصل ہوتا!" فلسفہ کی ان ہی بعض مشکلات کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

یک تنقیۂ دماغ می باید کرد!

(۱) فلسفے کی اصطلاحات دقیق ہوتی ہیں:-

فلسفہ، بلکہ ہر سائنس کی اپنی مخصوص زبان اور اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ کسی مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم کو اس مضمون کی اصطلاحوں سے اچھی

خاصی کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ فلسفے کی اصطلاحیں دقیق ضرور ہیں لیکن کس سائنس کی مصطلحات دقیق نہیں؟ فلسفے کو اعلیٰ و لطیف افکار کی ترجمانی کے لیے مخصوص و متعین زبان کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ زبان سوداسلف، لین دین کی زبان تو ہو نہیں سکتی، لازماً علمی و اصطلاحی زبان ہو گی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض دفعہ یہ غیر ضروری طور پر گران و ثقیل ہوتی ہے، جیسے فلاطینوس، کانٹ، نٹشے اور ہیگل کی تصانیف سخت عسیر الفہم زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے برخلاف فلاطون شوپنہور، بارکلے، ہیوم، جان اسٹوارٹ مل، ہنری برگسان ولیم جیمس، برٹرنڈ رسل، جارج سنٹیانا کی تصنیفات صاف شفاف اور خوشگوار ہیں۔

اصطلاحات کے بارے میں فلسفیوں کی بعض اور خصوصیات کی وجہ سے طلبہ کو فلسفے کے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔[1] فلسفی روزمرہ کے الفاظ کو خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ طالب علم تو ان الفاظ کے وہی معنی لیتا ہے جو

---

[1] ڈی ایس سائینس نے اپنی کتاب An Introdection to Living Philosophy. صفحہ ۳۰ تا ۳۷ میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جو راقم الحروف نے کیا ہے دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں "مقدمہ فلسفہ حاضرہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اس نے روزمرہ کے استعمال میں سیکھے ہیں اور اس طرح وہ فلسفی کے حقیقی معنی و مفہوم کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مثلاً پروفیسر وائٹ ہڈ جو زمانہ موجودہ کا ایک مشہور فلسفی ہے، اپنی تصانیف میں "حادثہ" (Event) کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اس کے فلسفے کا سنگِ زاویہ ہے اور جس کے معنی نہایت اصطلاحی ہیں اس میں شک ہے کہ فلسفے کے بعض اساتذہ نے بھی صاف طور پر سمجھا ہے کہ وائٹ ہڈ کی اس سادہ لفظ سے کیا مراد ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بھی شک کرنے کی گنجائش ہے کہ خود وائٹ ہڈ بھی جانتا ہے کہ درحقیقت اس لفظ سے وہ کیا تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ خود اس کا فلسفہ ابھی خام حالت میں ہے اور جوں جوں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا جا رہا ہے، ڈاکٹر وائٹ ہڈ 'حادثہ' کے لفظ کے مفہوم کو بدلتے جا رہے ہیں۔ اب اگر طالب علم 'حادثہ' کے عام معنی لے تو وہ اس فلسفی کی بحث کو کیا خاک سمجھ سکتا ہے؟ اسی طرح ہم بیشمار مثالیں ہم عصر مصنفین و عہد ماضی کے اکابر فلاسفہ کی تصانیف سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے فلسفے کے طالب علم کا ایک اہم مسئلہ یہ دریافت کرنا ہوتا ہے کہ فلسفی نے معمولی الفاظ کو کن اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے فلسفی کسی ایک مخصوص لفظ کو دوسرے سلسلہ میں خاص معنی پہنائیں جو کسی اور فلسفی

کے استعمال سے بالکل مختلف ہوں۔ فلسفہ کا ہر مسلک ایسی مخصوص اصطلاحی لغات کا استعمال کرتا ہے جن کو دوسرے مسلک کے فلاسفہ اختیار نہیں کرتے، الّا اس صورت کے جب ان کو مخالفین کی آرا کا ذکر کرنا پڑے۔ اسی ایک واقعہ نے بہتوں کو فلسفہ سے متنفر کر دیا ہے اور وہ اس کو محض لفاظی اور تجریدات کا گورکھ دھندہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن سوچو تو یہ حکم ان کی زودرنجی بلکہ بزدلی پر دلالت کرتا ہے اور فلسفہ کا اس میں زیادہ قصور نظر نہیں آتا جیسا کہ آپ خود فلسفہ کے موضوع بحث کی اہمیت سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلسفہ بازاری زبان تو استعمال نہیں کر سکتا، اور جب تک معمولی الفاظ میں نئے معنی نہ پیدا کرے وہ اپنے عمیق افکار کو ادا نہیں کر سکتا۔ زبان کا دامن اس قدر تنگ ہے!

(۲) فلسفیانہ غور و فکر کے لیے علم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ضروری ہوتا ہے:-

یہ بالکل صحیح ہے (جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں) کہ ہر شخص کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہی نخواہی وہ فلسفیانہ غور و فکر کرتا ہے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی میں فلسفیانہ استعجاب کے ساتھ ضرور پوچھا ہو گا کہ

"معلوم نشد کہ در طربخانۂ خاک
نقاش من از بہر چہ آراست مرا؟"

اور شاید اس کے جواب دینے کی بھی کوشش کی ہو۔ اس کوشش میں جس مواد کو شعوری و غیر شعوری طور پر اس نے استعمال کیا ہوگا وہ وہی ہوگا جو اس کے سماجی و مادی ماحول سے حاصل ہوا ہے۔ کائنات اور حیات کی ماہیت و غایت کے متعلق کسی نقطۂ نظر کے اختیار کرنے کے لیے انسان کو ابتدا، تو وہیں سے کرنی پڑتی ہے جہاں وہ ہے اور اسی مواد کو کام میں لانا پڑتا ہے جو وہ رکھتا ہے، تاہم ایک لمحہ غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام افراد انسانی میں سے فلسفی ہی وہ فرد بشر ہے جس کو سب سے زیادہ واقعات و معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، بالفاظ مختصر وہی اس علم کا زیادہ حاجتمند ہوتا ہے جس کی علوم مخصوصہ میں تنظیم کی گئی ہے تاکہ وہ اس کی مدد سے اس راز کو کھولے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ؎ کھلتا نہیں کھل کر بھی عجب راز ہے یہ! اگر بفرض محال وہ تمام علوم مخصوصہ کے طریقوں اور ان کے مسلمات و مفروضات و نتائج سے آگاہ ہو سکے اور نیز مذہب اخلاق اور فنون لطیفہ کا بھی نکتہ رس طالب علم ہو سکے تو اس کو ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں؟ اسی لیے کہ فلسفی ان حقائق سے بحث کرتا ہے جو اساسی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اقدار و معانی کی بصیرت رکھتا ہو، اور اسی لیے اس کا علم نہایت مفصل اور جامع ہونا چاہیے۔ اسی لیے فلسفہ مشکل ہے، آسان نہیں۔ کائنات کی گتھی

کے سلجھانے کی کوشش جواں مردوں کا کام ہے، بچوں کا نہیں پیر نابالغ کا نہیں کیونکر ے

اس دشت میں سینکڑوں کے جی چھوٹ گئے
پتھر بھی حباب کی طرح پھوٹ گئے!

فلسفے کے لیے نہ صرف علم کا عظیم الشان ذخیرہ ضروری ہے بلکہ ہر قسم کے تعصب جانبداری، پیچ سے بھی ذہن کا آزاد کرنا لازمی ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اسپنوزا نے اپنی تفلسف کا نصب العین یہ قرار دے رکھا تھا کہ کائنات کا "ابدیت کی روشنی" میں مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لیے فلسفی کو نہ صرف اپنی تنگیٔ نگاہ کو دور کرنا پڑتا ہے بلکہ کشمکشِ ہوا وہوس سے بھی نجات حاصل کرنی پڑتی ہے، کیونکہ بندۂ ہوس اسیرِ قفس ہوتا ہے اور صداقت سے محروم۔ فلسفی صداقت کا جویا ہوتا ہے اور صداقت ہی کی خاطر صداقت کی تلاش کرتا ہے نہ کہ کسی ذاتی غرض یا دلچسپی کی خاطر۔ اس کا نقطۂ نظر بالکل معروضی و خارجی ہونا چاہیے۔ یہی چیز فلسفہ کو ایک نہایت مشکل علم قرار دیتی ہے۔

(۳) فلسفہ کے مطالعہ کے لیے بڑی جسارت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے:۔

اگر عالمِ حیاتیات حیات کی بیشمار لطیف فعلیتوں کی سُراغ رسانی

میں — اپنے عجز کا احساس کرتا ہے، اور اگر عالم ہیئت اپنی دوربینوں سے لامتناہی فضا میں ان گنت ستاروں کو دیکھ کر، جو کروڑہا سال کے فاصلہ پر محو خرام ہیں، اپنی بے بساطی پر خجل ہوتا ہے، اور اگر علمار طبیعیات و کیمیا و نفسیات و اجتماعیات مظاہر کے ربط و ضبط کے قوانین کی دریافت میں حیران و سرگرداں نظر آتے ہیں، تو پھر فلسفی جس کا عظیم الشان کام ان علوم مخصوصہ کے مفروضات و نتائج کو یکجا کرنا اور کائنات من حیث کل کے متعلق ایک خاص نتیجہ تک پہنچنا ہے، کیوں نہ لاف و گزاف کو ترک کر کے سر عجز خم کرے! فلسفی کے موضوع بحث کی اسی وسعت کو دیکھ کر بارہا مختلف پیرایوں میں یہ خیال ادا کیا گیا ہے ؎

کس راپس پردۂ قضا راہ نہ شد
وز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند
معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد
(خیام)

اگر فلسفہ ایک لازمی و ناگزیر شے نہ ہوتا تو غریب فلسفی کی حیثیت مضحکہ انگیز ہوتی۔ لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ بقول ارسطو ہم "فلسفیانہ غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ کرنا چاہیں لیکن کرنا تو ضرور پڑتا ہے" انسان کو خواہی نخواہی فلسفہ کی ضرورت پڑتی ہے، عملی زندگی کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ماہیت

اشیاء و غایت و ہدایتِ انسانی کے متعلق مفروضات کو تشکیل دیں
اور ان کو تسلیم کریں۔ اس معنی میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ہوتا
ہے۔ لیکن اگر وہ چاہے تو اپنے اس اہم فریضہ کو ہاتھ میں لینے سے
پہلے جس قدر ذخیرۂ علم ممکن ہو سکے فراہم کر سکتا ہے۔ چونکہ تہذیب
و تمدن کی مشعل بغیر فلسفہ کے روشن نہیں رہ سکتی اسی لیے فلسفہ
کا وجود ضروری ہے، گو ہم اپنی "عقل نا صواب" کی شکایت سے
دفتر سیاہ کیوں نہ کرتے رہیں۔

(۴۴) فلسفہ اور فلسفیوں کی جو تحقیر کی جاتی ہے وہ ہمیں فلسفہ
کے مطالعہ کی طرف سے پست ہمت کرتی ہے۔

فلسفہ اور فلسفے کے حامی اکثر اعتراضات کا نشانہ بنتے رہے
ہیں، یہ اعتراضات نہ صرف ان دونوں کا مضحکہ اڑاتے رہے ہیں
بلکہ ان کی سخت تحقیر بھی کرتے آئے ہیں۔ استہزاء و حقارت
اس حد تک ضرور حق بجانب ہیں جس حد تک کہ فلسفہ محض
ان اثیری تخیلات کی تعبیر ہے جو منتِ کشِ معنی نہیں، اور یقیناً
فلسفہ بعض دفعہ محض بال کی کھال ہی کھینچا گیا ہے، اور بے
معنی مسائل میں اپنا وقت رائیگاں کیا ہے۔ لیکن کونسا علم
ایسا ہے جس میں اس قسم کی فضولی نہ ہوئی ہو؟ فلسفہ کی مخالفت
کی زیادہ تر وجہ یہ رہی ہے کہ اکثر فلسفیانہ مسائل جو عالم حواس
کے مادی سوالات سے ماوراء ہوتے ہیں اور جن سے کسی قدر

اصطلاحی زبان میں بحث کی جاتی ہے عوام کے لیے عسیر الفہم ثابت ہوئے ہیں۔ عوام جس چیز کو سمجھ نہیں سکتے اس کو بے معنی قرار دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب فلسفہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ محض دتخیلات کا جولانگاہ ہے، یا یہ عمومی وکلی اشیاء کے متعلق ہذیان وخرافات کے سوا کچھ نہیں، یا بقول میورہیڈ یہ ایسی چیز کا، جو ہر شخص جانتا ہے، ایسی زبان میں بیان کرنا ہے جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا؛ یا برخلاف علوم مخصوصہ کے جو ہمیں معلومات کا ذخیرہ عطا کرتے ہیں، فلسفہ صرف ماضی پر نگاہ ڈالتا ہے اور انسان کو ترقی کی راہ نہیں سجھاتا؛ یا یہ کہ فلسفہ "کیمیائے اوہام" کے سوا کچھ نہیں ۔ جب ہم فلسفہ کے متعلق اس قسم کی مزخرافات سنتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے قائل نہ تاریخ فلسفہ ہی سے واقف ہیں اور نہ فلسفہ کی موجودہ حیثیت سے!

غریب فلسفی پر جو پھبتیاں کسی گئی ہیں وہ اور زیادہ دلچسپ ہیں۔ ارسٹوفینس (پانچویں صدی قبل مسیح) فلسفہ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے سقراط کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اپنا دامن بادلوں میں گھسیٹتا چلتا ہے اور اس کی زبان سے وہ بکواس جاری ہوتی ہے جس کو 'فلسفہ' سمجھا جاتا ہے! نوابی زاآلکاٹ کے ذہن میں بھی اسی قسم کا فلسفہ تھا جب اس نے فلسفی کی تعریف اس طرح کی کہ فلسفی وہ شخص ہے جو ایک غبارے میں بیٹھا اوپر پرواز کر رہا ہے،

اور اس کا خاندان اور احباب رسی پکڑے ہوئے ہیں اور اس کو نیچے کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں! گوئٹے، فاؤسٹ میں امسٹو فلیس کی زبانی کہلواتا ہے: "مفکر کی مثال اس جانور کی سی ہے جس کو شیطان ایک برف زدہ مقام پر گھما رہا ہے گو اس کے اطراف میں سرسبز و شاداب چراگاہ بھی موجود ہے!" ملٹن فلسفہ کو دوزخیوں کا ایک مشغلہ قرار دیتا ہے۔ وہ دوزخ میں شیاطین کی مختلف مصروفیتوں کا ذکر کر رہا ہے، جو اپنے عذاب کے کم کرنے کے لیے فلسفیانہ غور و فکر میں حیران و سرگرداں ہیں:۔

"شیاطین ایک تنہا پہاڑی پر اپنے اعلیٰ خیالات میں منہمک ہیں، اور خدا، علم غیب، ارادے، قسمت یا تقدیر پر بحث کر رہے ہیں۔ مقدر، آزادی ارادہ، علم غیب مطلق پر غور و فکر ہو رہا ہے، لیکن ان کی بحث کا کوئی انجام نہیں، وہ ورطۂ حیرت میں گم ہیں خیر و شر، سعادت و الم، جذبہ و عدم رغبت، خوش بختی و بدبختی پر بحث جاری ہے؛ لیکن یہ ساری بیہودہ خیال بازی و رائے زنی ہے، باطل فلسفہ ہے!"

جامی فلسفہ کو "سخن طرازی، "افسوں گری" و "افسانہ سازی" اور "خیال بازی" قرار دیتے ہوئے فلسفی کو "سادہ دل" یا بیوقوف کہتے ہیں:۔

جامی تن زن سخن طرازی تا چند
افسوں گری و فسانہ سازی تا چند
اظہار حقائق بہ سخن ہست محال
اے سادہ دل این خیال بازی تا چند

جن فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ انھیں صداقت کا پتہ لگ گیا ہے ان کی مثال ان اندھوں سے دی جاتی ہے جو خواب میں اپنے کو بینا دیکھتے ہیں۔ ع

کوراں خود را بہ خواب بینا بینند

اس بیہودگی اور حماقت کا ذکر کرتے ہوئے جس میں تمام حیوانات میں سے صرف انسان ہی مبتلا ہے ٹامس ہابس کہتا ہے[1] "تمام انسانوں میں سے صرف وہی افراد اس میں سب سے زیادہ مبتلا ہیں جن کا مشغلہ فلسفہ ہے۔ کیونکہ سسرو نے ان کے متعلق کسی جگہ جو کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے: کوئی بیہودہ ولایعنی شے ایسی نہیں جو فلسفیوں کی کتابوں میں نہ ملتی ہو" اور ڈیکارٹ فلسفۂ جدید کا آدم کہتا ہے کہ "کالج کی زندگی ہی میں مجھے اس شے کا علم تھا کہ کوئی عجیب سی عجیب اور انوکھی سی انوکھی بات ایسی نہیں تصور کی جاسکتی جس کا کوئی نہ کوئی فلسفی قائل نہ ملتا ہو"[2]

---

[1] ہابس کی کتاب Leviathan [2] دیکھو ڈیکارٹ کی کتاب Discourse on Methods یہ دونوں حوالے رائنڈ کی ماڈرن کلاسکل فلاسفرز میں صـ۶۲ و صـ۱۱۱ پر ملینگے۔

مخصوص ماہر فن (Specialist) کی تعریف بعض دفعہ ظرافت آمیز طریقہ پر اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ حضرت ہیں جو کم سے کم شئے کا زیادہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں، اسی تعریف کو اُلٹ کر فلسفی کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ وہ ذی علم بزرگ ہیں جو زیادہ سے زیادہ شئے کا کم سے کم علم رکھتے ہیں! فلسفی کی مثال اس اندھے سے بھی دی گئی --- جو ایک تاریک کمرہ میں ایک کالی بلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود نہیں۔ اور حضرت اکبر الٰہ آبادی نے تو زیادہ متانت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں!

امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ممتاز پریسیڈنٹ اپنے طلبہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ تین چیزوں سے پرہیز کریں: شراب نوشی، تمباکو اور فلسفہ!

خود فلسفیوں نے فلسفہ پر شدت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے ہم نے اوپر ایجابیہ وارتیابیہ کے اعتراضات بیان کیے ہیں۔ یہاں پر چند اور نکتہ چینیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نیٹشے کہتا ہے کہ "رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بات روشن ہوئی ہے کہ ہر عظیم الشان فلسفہ اب تک صرف دو چیزوں پر مشتمل ہوتا آیا ہے: بانی کا اعتراف و اقرار، اور ایک قسم کی اپنی غیر ارادی و غیر شعوری سوانح حیات" پروفیسر

جان ڈیوے اور پروفیسر جو ایچ رابنسن کا خیال ہے کہ فلاطون سے لے کر اسپنسر تک کا فلسفہ سوائے پہلے ہی سے موجودہ اخلاقی و مذہبی و سیاسی تیعنات کو عقلی صورت بخشنے کی کوشش کے اور کچھ نہیں! بہت سارے مفکرین اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عہد سلف کے اکثر فلسفے کا محرک مذہبی ایمان و ایقان رہا ہے۔ عضویت کی اشتہاآت و خواہشات معاشری و تعلیمی اثرات ہی کے پیدا کردہ تیقنات کسی فلسفہ کی تعیین و تشکیل میں اہم اجزائے عاملہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ براڈلے نے ان ہی خیالات کی بناء پر فلسفہ کو ہمارے جبلی تیقنات کے متعلق خراب حجتوں کا دریافت کرنا قرار دیا تھا، لیکن وہ اس امر کا بھی اضافہ کرتا تھا کہ ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی خود ایک جبلی عمل ہے!

اس امر میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ فلسفہ کی جڑیں فطرت انسانی میں جمی ہوئی ہوتی ہیں، اور انسان کی زندگی پر جو معاشری اثرات ہوتے ہیں وہی فلسفہ کی تشکیل و تعیین کرتے ہیں۔ اسی لیے فشٹے نے تو کہا تھا کہ "جیسا آدمی ویسا فلسفہ!" لیکن یہ بھی حد امکان سے کوئی خارج شے نہیں کہ سچا فلسفی صداقت کی تلاش ہی کو اپنی غایت قرار دے لے، وہ صداقت جو "برہنہ صداقت" کہلاتی ہو، جو نہ کوئی دوست رکھتی ہو اور نہ کسی انعام کی خواہش اور نہ زجر و توبیخ کا غم اس قسم کی احتیاط سے، یعنی صداقت ہی کی تلاش کو اپنی غایت مقصود

قرار دے لینے سے فلسفی اپنے تیقنات کی جانبداری اور اپنے تنفرات کی دشمنی سے اپنے کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور اپنے فلسفہ کو ان سے متاثر ہونے سے بچا سکتا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ انسان انسان ہونے کی حیثیت سے تجسس و استعجاب کی نہ بجھنے والی آگ اپنی فطرت میں روشن پاتا ہے، اور جب تک یہ دنیا انسان کے ذہن کو مہیب و پُر اسرار نظر آتی رہیگی اس وقت تک فلسفہ آب و تاب کے ساتھ سخن راں و سخن آرا رہیگا۔ انسان فطرۃً عاقل ہونے کی وجہ سے اس وقت تک آرام و چین کی نیند نہیں سو سکتا جب تک کہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے پردہ نہ اُٹھ جائے! رابرٹ لوائی اسٹیونس نے اسی خیال کو ظریفانہ انداز میں اس طرح ادا کیا ہے: "بعض لوگ کائنات کو اسی طرح نگل جاتے ہیں جس طرح دوائی کی گولی کو۔" زندگی کے تنازعات و تخالفات سے بالکلیہ بے حس و بے خبر ہونے اور ہر چیز کو ایک ایسی سادہ لوحی کے ساتھ قبول کر لینے سے جس پر بے کسی و بے بسی برستی ہو، یہ بہتر ہے کہ ان کے متعلق ہماری زبان سے نظریہ کی شکل میں ایک چیخ نکل جائے" اور یہی چیخ ہمارا فلسفہ ہوتا ہے!

(۵) متناقض فلسفیانہ نظریات ذہنی اضطراب پیدا کرتے ہیں:۔

فلسفے کے مبتدی کو فلسفے کی سب سے زیادہ اہم مشکل یہ معلوم

ہوتی ہے کہ اکابر فلاسفہ کا اساسی مسائل کے متعلق اتفاق نہیں۔ ان کے طریقے اور ان کے نتائج ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نظر آتے ہیں کہ طالب علم کو شبہ ہوتا ہے کہ آخر ان کے تضاد و تخالف کے بعد کوئی قابلِ قبول شے باقی بھی رہ جاتی ہے، یا پردۂ غیب سے یہ آواز سننی پڑتی ہے کہ ع اے بے خبراں راہ نہ آنست و نہ ایں!؟

اس امر کا خیال رکھتے ہوئے کہ فلاسفہ کے باہمی اختلاف کی کچھ تو وجہ اپنے اپنے زمانہ کے مختلف اصطلاحات و حدود کا استعمال ہے۔ طالب علم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا بقول جوشیار اس "تجربہ کا ایک لامتناہی خزانہ ہے" اور جو لوگ اپنی فطرت و ساخت تعلیم و تربیت میں مختلف ہیں ان کا اسی ایک دنیا پر ردعمل بھی مختلف ہوگا۔ بالفاظ دیگر فلسفی کی انفرادیت کے اختلاف کی وجہ سے نظریات کائنات میں اختلاف کا پیدا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ نظریات (جن کا مجموعہ فلسفہ ہے) پیداوار ہیں دنیا اور ان مختلف ذہنوں کے باہمی عمل کا جو اس متنوع و نامحدود دنیا کے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ہم کسی فلسفی کی آراء کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان طبیعی، حیاتیاتی و معاشرتی اجزاء کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہیے جو اس کے تیقنات و اذعانات کی تشکیل و تعیین میں ضروری حصہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ طریقِ کار چند اکابر فلاسفہ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو تخالفِ آراء کی وجہ سے فلسفہ سے گریز کرنے کا میلان اگر

غائب نہ ہو جائے تو کم ضرور ہو جائیگا۔ علاوہ ازیں یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جہاں کہیں انسان نے تجربہ کے واقعات پر غور و فکر کرکے ان کے تعمیم کی کوشش کی ہے، خواہ وہ سائنس میں ہو یا روزمرہ کی زندگی میں، وہاں رائے اور یقین کا اختلاف ضرور پیدا ہوا ہے۔ قائدینِ فکر کے نیقنات کا یہ اختلاف دنیائے جو زندگی کے اہم مسائل کے متعلق پیدا ہوتا ہے دراصل ایک نعمت ہے، کیونکہ اسی تنقید و اختلاف سے فلسفیانہ روح بیدار ہوتی ہے اور زندگی اور کائنات کے متعلق عمیق تر حقائق و بصائر حاصل کرتی ہے۔ ہیوم کی تباہ کن تنقید نے کانٹ کو خوابِ ادعائیت سے بیدار کیا جس کی وجہ سے فلسفہ کا ایک عظیم الشان نظام پیدا ہو سکا۔ کوئی سنجیدہ آدمی محض اس وجہ سے کہ اکابرِ فلاسفہ کی آرا میں اختلاف پایا جاتا ہے فلسفہ سے بیزار اور رو گرداں نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس کی مثال اس بیمار کی سی ہوگی (جس کا ذکر ہیگل کرتا ہے) جس کو ڈاکٹر نے میوہ کھانے کی ہدایت کی تھی، اس لئے سیب، ناشپاتی انگور کھانے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس کو تو "میوہ" کھانے کے لیے کہا گیا تھا اور یہ سیب، ناشپاتی وغیرہ تو محض سیب ناشپاتی ہی ہیں (یعنی جزئی) اور میوہ نہیں (یعنی کلی)

(٦) شک کا خطرہ فلسفی کو لگا رہتا ہے۔

فلسفہ صداقت کی پیہم مسلسل، غیر جانبدارانہ تلاش ہے

ممکن ہے کہ اس تلاش میں وہ تصورات و تیقنات جو محض روایتوں اور دیگر ناکافی شہادتوں پر مبنی ہوں ٹھکرا دیے جائیں۔ کیونکہ صداقت کی مثال ایک متکبر شہزادی کی سی ہے جو اپنے ہوا خواہوں سے کامل انقیاد و فرمانبرداری چاہتی ہے۔ پشوپہور اس "اچھے، مرفہ الحال یونیورسٹی کے فلسفہ" کا مضحکہ اڑاتا ہے، جس کے ہزاروں مقاصد اور لاکھوں محرکات ہوتے ہیں۔ جو نہایت احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہے، جس کی نظروں کے آگے ہمیشہ خدا کا خوف، وزارت کی مرضی، کلیسا کے قوانین، ناشرین کتب کی خواہشات، طلبہ کی حاضری، رفقاء کی حسنِ ارادت، سیاسیات حاضرہ کا رجحان اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خیال ہوتا ہے!" اس کے برخلاف صحیح فلسفہ کی تعریف میں وہ کہتا ہے کہ "یہ اُس برہنہ صداقت کا جویا ہے جو نہ کوئی مونس و غمخوار رکھتی ہے، جس کو نہ کسی انعام کی خواہش ہے اور نہ زجر و توبیخ کا اندیشہ" ظاہر ہے کہ ایسا فلسفہ ان عقائد و اذعانات کو تباہ و برباد کر دیگا جن کی بنیاد توہمات و غیر صحیح روایات پر قائم ہے۔ اگر ہمارے اخلاقی اور مذہبی عقائد تنگ اور کوتاہ ہوں تو فلسفہ کا مطالعہ ان میں ضرور اختلال و اضطراب پیدا کریگا۔ اگر آپ فلسفہ سے یہ توقع رکھیں کہ وہ آپ کے ان جبلی و مذہبی عقائد و تیقنات کو حق بجانب ثابت کر دکھائے اور صداقت کی پیروی نہ کرے تو پھر آپ بقول برٹرنڈ رسل کے

اپنے محافظ سے بھی اس امر کی اُمید کر سکتے ہیں کہ بجٹ میں باوجود خسارہ ہونے کے آپ کو اضافہ ہی کی خوشخبری دیتا رہے! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنے کمزور اور متزلزل تیقنات و عقائد کو جن کی بنا غلط روایات اور جاہلانہ رواج پر قائم ہے محک تنقید پر جانچیں (گو یہ عمل ہمارے لیے نہایت ہی دردناک اور تکلیف دہ کیوں نہ ثابت ہو) اور دیکھیں کہ یہ غلط اور نقصان رساں تو نہیں؟ جن تیقنات کے متعلق ہمیں یہ خوف ہو کہ سائنس کے بڑھتے ہوئے معلومات ان کو تباہ کر دینگے ان سے ہمیں کس قسم کی تسلی یا تشفی نصیب ہو سکتی ہے؟ اور ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق کے بعد ان کے متعلق یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ انسان کی بالکل ابتدائی تہذیب کے باقیات ہیں اور محض توہمات! علاوہ ازیں ممکن ہے کہ یہ محض غلط ہوں اور عمل میں نقصان رساں! سینٹ پال کے اس قول میں ہم صحیح فلسفیانہ بصیرت پاتے ہیں" : تمام چیزوں کو جانچو، صرف اسی چیز کو مضبوط پکڑو جو اچھی ہو"

یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "عہد ایمان" ضروری طور پر اخلاق حسنہ کا عہد رہا ہے۔ اور "عہد ارتیاب" فسق و فجور اور رداءۃ اخلاق کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ ایمان کس قسم کا ہے اور ارتیاب کس قسم کا؟ محض تحکمانہ ایمان اور مذہبی جذبہ سے اخلاقی ادعانات اور اخلاقی جوش عمل کو جانچا نہیں جا سکتا۔

زہد عیاں، 'فسق پنہاں' کی بیشمار مثالیں بھلائی نہیں جاسکتیں، محض 'روبخاک' ہونے اور جامۂ پاک پہننے اور پناہ ریش لینے سے انسان پاک باز و نیک کردار نہیں بن سکتا۔ خیام نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

شیخے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی! ہر لحظہ بہ دامِ دگرے پابستی!
گفتا، شیخا! ہر آنچہ گوئی ہستم! اما تو چناں کہ می نمائی ہستی!

مذہب پر یقین رکھ کر تسبیح ہزار دانہ ہاتھ میں لے کر اور جامۂ صوف پہن کر بھی آدمی معاملاتِ زندگی میں شیطان کو شرما سکتا ہے! اس کے برخلاف محض ریب و شک ہی کی بنا پر انسان دائرۂ اخلاق سے خارج نہیں ہو جاتا۔ بچوں کا میلان یقین کی طرف ہوا کرتا ہے لیکن صرف سنجیدہ اور ذی علم شخص ہی شک کر سکتا ہے، مفکر کے لیے شک علمی ترقی کا ایک ضروری زینہ ہے۔ جس نے شک کرنا نہیں سیکھا اس نے غور و فکر کرنا ہی نہیں سیکھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر شک فکر نہیں۔ ایک کاہل شخص کسی مسئلہ کو حل کرنے کی جانکاہ کوشش سے بچنے کے لیے شک کے دامن میں پناہ لے سکتا ہے، یا یہ ایک ایسے ذہن کا غیر شعوری استدلال ہو سکتا ہے جس پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ فلسفیانہ طور پر وہی شک جائز رکھا جا سکتا ہے جو بے غرض ہو اور باقاعدہ و منظم ہو۔ اس نقطۂ نظر سے شک کوئی غایت نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے، فکر کی ترقی

و تقدم کا ایک لازمی و لابدی درمیانی زینہ جو صداقت کے ادنیٰ، کم تر و تنگ تر مقام سے اعلیٰ بہتر و وسیع و کشادہ مقام تک پہنچنا چاہتا ہے پروفیسر ڈبلیو۔ کے، کلفرڈ نے کہا تھا کہ "کسی چیز کو ناکافی شہادت کی بنا پر مان لینا ہر شخص کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ غلط ہے" کلفرڈ کے اس صداقت بھرے جملے کو ہر فلسفیانہ مزاج شخص بلا تامل ماننے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ تاہم اس میں صرف اس قدر اضافہ کرنا ضروری ہے (ولیم جیمس نے اس کو اپنے مشہور و معروف مضمون 'ارادۂ ایمان' میں اچھی طرح پیش کیا ہے) کہ اگر کسی رائے کی موافقت میں شہادت معقول اور ظنی ہو، لیکن کامل نہ کہلائی جا سکتی ہو گو اس سے زیادہ قابل حصول بھی نہ ہو۔ اور اگر کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ اس ظنی صداقت کے قبول کرنے سے وہ ایک بہتر و برتر فرد بن سکتا ہے اور دوسروں کی بھی زیادہ خدمت کر سکتا ہے تو پھر کیا اس کا یہ فریضہ نہ ہوگا کہ اس پر یقین کر لے؟

فلسفہ کا مطالعہ دو دھاری تلوار ہے جس سے انسان کو فائدے بھی پہنچ سکتے ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن یہ حال ہر علم کا ہے فلسفہ ہی کی تخصیص نہیں[1]۔ مثلاً سیاسیات، طب، ادب،

---

[1] اندلس کے ایک کہنہ سال پختہ کار فلسفی کی زبانی سنو "نفع و ضرر کی متضاد استعداد سے دنیا کی کون چیز مستثنیٰ ہے؟ غذا کا تداخل اور اس کی کثرت معدہ میں بار پیدا کرتی ہے۔ پس کیا اس بنا پر تم یہ طبی قاعدہ (باقی بر صفحہ ۱۱۶)

وغیرہ کے مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی معاشرہ کے نقصان وضرر کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فلسفہ کی تعلیم کی وجہ سے انسان صحیح چیز کو غلط، نیک کو بد بنا سکتا ہے اور صداقت کو محض اضافی چیز قرار دے سکتا ہے۔ سوفسطائیوں نے یہی کیا اور خیر وحسن وصداقت کو محض اضافی اقدار قرار دیا۔ فلسفہ کا مطالعہ انسان کو پُرانا شکی، کٹر ایجابی اور خود پرست کلبی بنا سکتا ہے جو اپنے غرور وتکبر، خود غرضی وایغویت کی بنا پر خود کو بینا اور دوسروں کو کور، خود کو سردار دوسروں کو غلام قرار دیتے ہیں۔ دیو جانس کلبی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ ایک روز اتھینا میں پکارنے لگا "لوگو میری طرف آؤ" جب چند لوگ اس کی طرف بڑھے تو اس نے انہیں اپنے سوٹنے سے مار بھگایا اور کہا کہ "میں نے تو آدمیوں کو بلایا تھا تم تو بول و براز ہو۔" فلسفہ کی تعلیم سے اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہونا ممکنات سے ہے۔ اس کے برخلاف اس امر کا بھی زیادہ احتمال ہے

(بقیہ صفحہ ۱۱۵) مقرر کر سکے کہ تغذیہ طبعاً مضر ہے؟ اصل یہ ہے کہ بیدینی فلسفہ کی تعلیم کا لازمی نتیجہ نہیں۔ کیا صرف فلاسفہ بیدین ہوتے ہیں، فقہا کبھی گمراہ نہیں ہوتے حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ فلسفہ سے زیادہ فقہ سے بیدینی کی اشاعت ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ فقہ کی بیدینی پر جبہ و عمامہ پردہ ڈالے رہتے ہیں، اس کی بداخلاقیاں ہمیشہ مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں، اس لیے عام لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی"

(ابن رشد مصنفہ مولوی محمد یونس صفحہ ۱۶۵ و صفحہ ۱۶۶)

کہ جو شخص فلسفہ کا مطالعہ سچائی و ثابت قدمی کے ساتھ کرتا ہے تو اس میں ایک قسم کی تنقیدی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر، نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور مخالفین کی آرا کے ساتھ تحمل و مسامحت سے پیش آ سکتا ہے۔ چونکہ فلسفی میں جاننے اور سمجھنے کی نہایت شدید خواہش پائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ منطقی سرعتِ ذہنی و احتیاط بھی موجود ہوتی ہے، لہذا وہ جن چیزوں کو قبول کرتا ہے ان کو بھی وہ مشروطی و موقتی قرار دیتا ہے اور ان کو نئے علم کی روشنی میں قابلِ تغیر سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ نئے نظریات کو قبول کرنے اور قدیم نظریات میں تغیر پیدا کرنے کے لیے کھلا رہتا ہے۔ فلسفی کی دعا یہ ہوتی ہے کہ "خدایا مجھے ایک کشادہ اور کھلا ذہن عطا فرما، بند ذہن نہیں جو نئے علم کی روشنی کی شعاع کو داخل ہونے نہ دے" اور یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ فلسفی کے اخلاقی اور ذہنی تیقنات نہیں ہوتے۔ وہ فراخ دلی و حزم و احتیاط کے ساتھ خاص خاص اخلاقی و ذہنی نتائج تک پہنچتا ہے اور ان پر یقین کرتا ہے۔

فلسفہ کی ان مختلف مشکلات کا خیال رکھتے ہوئے جن کا نہایت اجمال کے ساتھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہم عاشق کی زبان میں عشق کی بجائے فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں:-

اے عشق! بہ دردِ تو سرے می باید
صیدِ تو ز من قوی ترے می باید

من مرغ بیک شعلہ کبابم بگذار
کایں آتش را سمندرے می باید

(ابو سعید حمنہ)